# منظر اور پس منظر

## حیدر قریشی

ناشر

سرور ادبی اکادمی۔جرمنی

Sarwar Adabi Akademi,Germany

.....................

www.urdustan.com/





نام کتاب : منظر اور پس منظر

(حالاتِ حاضرہ پر لکھے جانے والے کالم)

مصنف : حیدر قریشی

سال اشاعت: ۲۰۰۴ء

تعداد : پانچ سو

طابع:۔۔۔۔۔۔جھوک پرنٹرز ملتان (پاکستان)

سرورق: اختر بیگ

تزئین:۔۔۔۔۔۔۔۔شاہد دھریجہ

**قیمت:**=/120 روپے

ناشر: سرور ادبی اکادمی۔جرمنی

بہ اشتراک اردوستان ڈاٹ کام (امریکہ)

**اظہارِ تشکر**: برادرم خورشید علی (جرمنی) کا شکریہ!
جن کے تعاون سے اس کتاب کی اشاعت ممکن ہوسکی

مصنف کا پتہ

Haider Qureshi
Rossertstr.6, Okriftel,
65795-Hattersheim,
Germany.

ای میل: haider_qureshi2000@yahoo.com

## صدرِ پاکستان

# جنرل پرویز مشرف کے نام

جنہوں نے بالکل جائز بنیاد پر ملک کا اقتدار سنبھالا،
جنہوں نے یکا یک بدلتے ہوئے عالمی حالات میں
بہت سے ناگوار سہی مگر بروقت اور درست فیصلے کئے،
جنہوں نے اقتصادی لحاظ سے ڈوبتے ہوئے ملک
کو کسی طرح سہی، اقتصادی زبان میں سنبھالا دیا،

**لیکن**

جنہوں نے اندرون ملک، قومی دولت لوٹنے والوں
سے کسی سیاسی امتیاز کے بغیر ملک کی دولت واپس لانے
کا سب سے اہم اور بنیادی فرض فراموش کر دیا ہے،
اور جو اپنی سیاسی مجبوریوں کے باعث بہت سے بڑے
چوروں کا سیاسی تعاون حاصل کرنے کے لئے انہیں
اپنے سیاسی سیٹ اپ میں حصہ دار بنائے بیٹھے ہیں۔



**جنرل پرویز مشرف** کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے کسی بھی سابقہ فوجی یا سول حکمران کے مقابلہ میں پریس کو نہ صرف سب سے زیادہ آزادی دی ہے، بلکہ اپنی ذات پر ہونے والی ہر تنقید کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کیا ہے۔

گھنی تاریکیوں میں روشنی کی آس باقی ہے
یہی دولت بہت ہے جو ہمارے پاس باقی ہے

# ترتیب


| | | |
|---|---|---|
| ا ابتدائیہ: منظر اور پس منظر | | ۷ |
| ۱۔ ہماری اجتماعی غلطیاں | ۱۵/اپریل۲۰۰۲ء | ۱۲ |
| ۲۔ اختلافِ عقیدہ کی بنیاد پر نفرت کیوں؟ | ۸/اپریل۲۰۰۲ء | ۱۶ |
| ۳۔ مغرب، مشرق اور افغانستان | ۲۲/اپریل۲۰۰۲ء | ۲۰ |
| ۴۔ تہذیبوں کا ٹکراؤ | ۲۹/اپریل۲۰۰۲ء | ۲۴ |
| ۵۔ تاریخی تسلسل پر ایک نظر | ۶/مئی۲۰۰۲ء | ۲۷ |
| ۶۔ تاریخ سے فرار کیوں؟ | ۱۳/مئی۲۰۰۲ء | ۳۱ |
| ۷۔ اتنا ظلم مت کیجئے | ۲۰/مئی۲۰۰۲ء | ۳۶ |
| ۸۔ ٹریڈ سنٹر پر اصل حملہ آور کون؟ | ۲۷/مئی۲۰۰۲ء | ۴۰ |
| ۹۔ جہاد اور بعض اہم مذاہب کی تعلیمات | ۲/جون۲۰۰۲ء | ۴۵ |
| ۱۰۔ امریکہ، ایشیا اور جنوبی ایشیا | ۱۷/جون۲۰۰۲ء | ۵۰ |
| ۱۱۔ امریکہ اور ہم | ۲۴/جون۲۰۰۲ء | ۵۵ |
| ۱۲۔ فلسطینیوں کے لئے جانوروں جتنے حقوق کی اپیل | ۱/جولائی۲۰۰۲ء | ۶۰ |
| ۱۳۔ آیئے ہم سب مختاراں بی بی کے لئے روئیں | ۸/جولائی۲۰۰۲ء | ۶۴ |
| ۱۴۔ انڈو پاک، مسائل اور مستقبل | ۲۲/جولائی۲۰۰۲ء | ۶۹ |





| | | |
|---|---|---|
| ۱۵۔ جنرل پرویز مشرف اور پاکستان | ۵/اگست۲۰۰۲ء | ۷۳ |
| ۱۶۔ انتہائی خطرے کی گھنٹی | ۱۲/اگست۲۰۰۲ء | ۷۷ |
| ۱۷۔ جنرل مشرف، بے نظیر اور شریف فیملی | ۲۶/اگست۲۰۰۲ء | ۸۱ |
| ۱۸۔ گیارہ ستمبر اور نئے عالمی امکانات | ۲۳/ستمبر۲۰۰۲ء | ۸۵ |
| ۱۹۔ متحدہ مجلس عمل، امریکہ اور افغانستان | ۱۶/اکتوبر۲۰۰۲ء | ۹۱ |
| ۲۰۔ عمران خان سے عالمِ اسلام تک | ۲۸/اکتوبر۲۰۰۲ء | ۹۵ |
| ۲۱۔ امریکی رویوں میں تبدیلی کے آثار | ۱۱/نومبر۲۰۰۲ء | ۱۰۰ |
| ۲۲۔ سارک یونین کا قیام وقت کی ضرورت | ۵/جنوری۲۰۰۳ء۔ | ۱۰۴ |
| ۲۳۔ عراق پر اینگلو امریکن حملہ | ۳۰/مارچ۲۰۰۳ء | ۱۰۹ |
| ۲۴۔ موجودہ حالات اور مذہبی پیشگوئیاں | ۳/اپریل۲۰۰۳ء | ۱۱۵ |
| ۲۵۔ تصویر کا ایک اور رُخ۔۔ آئندہ امکانات | ۱۸/نومبر۲۰۰۳ء | ۱۲۱ |

# ابتدائیہ

## منظر اور پس منظر

ایک شاعر اور ادیب ہوتے ہوئے مجھے اس صحافیانہ کالم نگاری کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ میرے ادبی دوستوں کو یقیناً اس پر حیرت ہوگی۔ گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء کے بعد عالمی سیاسی اخلاقیات اور اصولوں کی دنیا کا نقشہ جس سرعت کے ساتھ تبدیل ہوا، اس پر باقی دنیا کی طرح میں بھی عجیب سے دکھ اور بے بسی کی کیفیت میں مبتلا تھا۔ شاعری یا کہانی کی صورت میں کچھ لکھنے کا ارادہ کیا تو جو کچھ لکھا گیا وہ میرے نزدیک صحافتی سطح کی شاعری اور اسی سطح کے افسانے بنتے تھے۔ میں نے دو نظمیں اور تین افسانے لکھ تو لئے لیکن میری ان نظموں اور کہانیوں نے ہی مجھے روک لیا۔ صحافت کا اپنا ایک جہان ہے، جو ادب سے قربت رکھنے کے باوجود بالکل الگ جہان ہے۔ میں ادب اور صحافت میں پیش کش کے بنیادی فرق کو ہمیشہ ملحوظ رکھتا ہوں۔ اسی لئے صحافیانہ انداز میں کہانیاں لکھنے والوں کی طرح اپنی کہانیاں پیش کر کے میں اس موضوع، اس انسانی اور عالمی سیاسی المیہ پر اپنے جذبات کا پورے طور پر اظہار نہیں کر پاتا۔ بے شک بعض بڑے افسانہ نگاروں نے بعض ہنگامی موضوعات کو مس کر کے بھی بڑی کہانیاں لکھی ہیں لیکن میری لکھی کہانیاں مجھے ادبی تقاضوں سے ہٹ کر سطحی ہونے کا احساس دلا رہی تھیں۔ چنانچہ ان کہانیوں اور نظموں کے کہنے پر میں نے ان سب کو ضائع کر دیا۔

باخبری کتنی بڑی نعمت اور کتنا بڑا عذاب ہے؟ مجھے ہمیشہ سے اس کا احساس رہا ہے کیونکہ میں اخبارات کا مستقل قاری ہوں۔ اپنے ارد گرد سے بے خبر نہیں رہ سکتا۔ پھر نائن الیون کے بعد جو قیامتیں گزری ہیں، ان سے کیسے بے خبر یا بے تعلق رہ سکتا تھا! میں عالمی اور ملکی صورتحال پر مختلف



انداز سے غور کرنے اور اسے اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق سمجھنے کے نتیجہ میں مختلف ذہنی کیفیتوں سے گزرتا رہا۔ اسی عرصہ میں نائن الیون کے سانحہ کو چھ ماہ گزر گئے۔

اور پھر وہ ۲۳/مارچ ۲۰۰۲ء کا دن تھا۔ جب میں اسی گومگو، بے چینی اور کرب کی کیفیت میں مبتلا تھا۔ عالمی صورتحال سے لے کر علاقائی اور ملکی صورتحال تک جو کچھ دکھائی دے رہا تھا اس سب سے نجات کی کوئی صورت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اسی بے یقینی، بے بسی اور دکھ کی حالت میں کوئی نظم یا کہانی لکھنے کے بجائے حالاتِ حاضرہ پر براہِ راست لکھنے کی تحریک ہوئی۔ اور اسی دن میں نے ایک آرٹیکل لکھا جس کا عنوان رکھا ''ہماری اجتماعی غلطیاں''۔۔۔ پھر اسی دن شام کو ایک اور آرٹیکل لکھا۔ ''اختلافِ عقیدہ کی بنیاد پر نفرت کیوں؟''۔۔۔ یہ دونوں آرٹیکل اسی دن میں نے ای میل کے ذریعے اپنے کرمفرما ہارون عباس کو ان کی ویب سائٹ القمر آن لائن ڈاٹ کام کے لئے بھیج دیئے۔

تب ہم اکثر ہاٹ میل میسنجر پر دن میں کئی کئی بار ملا کرتے تھے۔ ہارون عباس سے اسی دن طے ہو گیا تھا کہ اگر ایسا کچھ لکھوں گا تو ان کو بھیجوں گا۔ شومئ قسمت کہ اِدھر میں نے ان کو اپنے آرٹیکل بھیجے ' اُدھر ان کی ویب سائٹ کسی ٹیکنیکل مسئلے کی وجہ سے غائب ہو گئی۔ تاہم اس دوران میں نے اپنے آرٹیکل کے لئے ''منظر اور پس منظر'' کا نام بھی طے کر لیا۔ جب القمر آن لائن زیادہ دیر کے لئے آف لائن ہو گئی تو میں نے امریکہ میں قائم اردو کی ویب سائٹ ''اردوستان ڈاٹ کام'' کے کاشف الہدیٰ سے بات کی۔ انہوں نے کالم منگا کر پڑھے۔ کچھ ان پر ڈسکس ہوئی اور پھر اسے اردوستان کا مستقل کالم بنا لیا گیا۔ ابتدا میں ایک سہو یہ ہوا کہ پہلے کالم کو بعد میں اور بعد والے کالم کو پہلے لگا دیا گیا۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ ترتیب کے لحاظ سے یہ دونوں کالم اسی طرح لکھے گئے تھے جیسے اوپر ذکر کر چکا ہوں۔ اور اصلاً ۲۳ مارچ ۲۰۰۲ء کو لکھے گئے تھے۔ جبکہ اردوستان ڈاٹ کام پر ۸/اپریل ۲۰۰۲ء اور ۱۵/اپریل ۲۰۰۲ء کو آن لائن ہوئے۔

باقی کے سارے کالم جیسے جیسے لکھے جاتے تھے ویسے ویسے ہی کاشف الہدیٰ صاحب کو بھیج دیئے جاتے تھے اور عموماً ایک دو دن کے وقفہ کے ساتھ آن لائن ہو جاتے تھے۔ ہر کالم کے ساتھ میں نے فہرست میں ہی آن لائن کئے جانے کی تاریخ درج کر دی ہے تا کہ کسی واقعہ کو اس کے زمانی پس منظر میں رکھ کر بھی سمجھا جا سکے۔ اس کے لئے کاشف الہدیٰ صاحب کا شکر گزار ہوں کہ

انہوں نے ازخود تاریخوں کے اندراج کا کام کر کے میرے لئے سہولت پیدا کر دی۔

اگرچہ ہارون عباس صاحب نے بھی اپنی سائٹ کے مزاج کے مطابق میرے بہت سے کالم اپنی سائٹ القمر آن لائن پر لگا رکھے ہیں تاہم ۲۵ کالموں پر مشتمل اس کی پوری فائل صرف کاشف الہدیٰ صاحب کی ویب سائٹ www.urdustan.com پر دستیاب ہے، اور اب یہ سارے کالم کتابی صورت میں شائع ہو رہے ہیں۔ یہ کالم میری کسی سیاسی بصیرت کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ حالاتِ حاضرہ پر میرے دکھ اور کرب کے اظہار کے ساتھ ان حالات سے نکلنے اور دنیا کو جنتِ ارضی کی صورت میں دیکھنے کی خواہش کا نتیجہ ہیں۔ اسے کسی اچھے صحافی کی تحریریں نہیں سمجھیں بلکہ ایک عام پاکستانی ذہن اور ایک چھوٹے سے ادیب کی ذہنی کیفیات سمجھیں۔ میں اپنے ادبی اصولوں پر قائم ہوں، جن کے مطابق شدید دکھ کی کیفیات پر فوری طور پر تخلیقی اظہار ممکن نہیں ہوتا اور ایسا جو کچھ لکھا جاتا ہے وہ عموماً اچھا فن پارہ نہیں بن پاتا۔ اسی لئے حالاتِ حاضرہ کے شدید دباؤ کے باعث میں نے اپنے دکھ کے اظہار کے لئے ادب کے نام پر سطحی تخلیقات پیش کرنے کی بجائے براہِ راست موجودہ حالات پر اپنے جذبات اور خیالات کا اظہار کر دیا ہے۔ میرے لئے ایسا کرنا ناگزیر تھا ورنہ شاید میرا دَم گھٹ جاتا۔

''منظر اور پس منظر'' کے تحت میں نے جو کچھ لکھا ہے ان میں سے تین اہم نکات ایسے ہیں، جو ویسے تو نئی بات نہیں تھے لیکن جن کو موجودہ سنگین حالات کے تناظر میں شاید مجھے ہی پہلی بار پیش کرنے کی توفیق ملی ہے۔ عین اس وقت جب انڈیا اور پاکستان کی فوجیں آمنے سامنے آ گئی تھیں جنگ کا شدید خطرہ تھا تب میں نے جنوبی ایشیا میں مستقل امن کے قیام کی خواہش کے ساتھ ایوب خان کے دور میں ہندوستان کو خصوصی دوستی کے لئے کی جانے والی ایک پیش کش کا ذکر کرتے ہوئے یوروپی یونین کی طرز پر سارک یونین کو متحرک کرنے کا ذکر کیا تھا۔ (ایوب خان نے صرف مشترکہ دفاع ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے ساتھ ایک ڈھیل ڈھالی کنفیڈریشن قائم کر لینے کا عندیہ دیا تھا) اس حوالے سے میرا پہلا کالم ۲۲ر جولائی ۲۰۰۲ء کو آن لائن ہوا (انڈو پاک مسائل اور مستقبل)۔ اور دوسرا کالم ۵ر جنوری ۲۰۰۳ء کو آن لائن ہوا (سارک یونین کا قیام وقت کی ضرورت)۔ مذکورہ پہلے کالم کے بعد سارک یونین کے حوالے سے محترمہ بے نظیر بھٹو نے اپنے ایک مضمون (''ہماری خارجہ پالیسی اور خطہ کی صورتحال'' از بے نظیر بھٹو۔ جنگ۔ انٹرنیٹ ایڈیشن



25ر دسمبر 2002ء) میں سارک یونین کو یورپین یونین کی طرز پر متحرک کرنے کی بات کی۔ ان کے اسی مضمون کے نتیجہ میں میں نے اس موضوع پر اپنا دوسرا کالم ۵ر جنوری ۲۰۰۳ء کو پیش کیا۔ پھر بنگلہ دیش میں مئی ۲۰۰۳ء میں ہونے والی ایک اہم کانفرنس میں مشاہد حسین نے مشترکہ دفاع کے مسئلہ پر ایوب خان کی پیش کش کا حوالہ پیش کرتے ہوئے یہ انکشاف کیا کہ ایوب خان سے پہلے قائدِ اعظم نے بھی ہندوستان کو مشترکہ دفاع کا مشورہ دیا تھا۔ اس کے نتیجہ میں ارشاد احمد حقانی نے اپنے کالم (''پاک بھارت تعلقات۔۔ایک تجزیہ'' جنگ انٹرنیٹ ۷ جون، ۸ جون ۲۰۰۳) میں اس اہم نکتہ کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ مجھے خوشی ہے کہ ہمارے بڑی سطح کے قومی دانشور جس نہج پر سوچ رہے ہیں میرے جیسے عوام بھی لگ بھگ اسی میں اس خطے کی نجات محسوس کرتے ہیں۔ یہ الگ بات کہ ان پر عمل درآمد کی نوبت نہیں آنے دی جا رہی کیونکہ پورے خطے کے برسرِ اقتدار بیشتر ٹولوں کے مفادات باہمی دشمنی کے ڈرامے میں ہی پورے ہوتے ہیں۔

دوسری بات۔۔میں نے اپنے بچپن میں ایک کتابچہ پڑھا تھا **الکفر ملة واحدة** جس میں بتایا گیا تھا کہ اسرائیل کے قیام سے مسئلہ صرف یروشلم کا نہیں بلکہ مسئلہ خود مکہ اور مدینہ کی عزت، سلامتی اور آزادی کا ہے۔ کیونکہ گریٹر اسرائیل کے نقشہ میں مکہ اور مدینہ کو شامل رکھا گیا ہے۔

اسی وجہ سے میں نے اپنے دو کالموں ''تاریخ سے فرار کیوں'' (۱۳ر مئی ۲۰۰۲ء) اور ''انتہائی خطرے کی گھنٹی'' (۱۲ر اگست ۲۰۰۲ء) میں اسی حوالے سے نشاندہی کر دی کہ اب مکہ اور مدینہ پر عالمی گِدھ منڈلانے لگے ہیں۔ میرے دوسرے کالم کے بعد نہ صرف بعض مقتدر کالم نگاروں نے اپنے طور پر اسی حوالے سے کالم لکھے بلکہ مختلف ٹیلی ویژن چینلز پر بھی اس سنگین مسئلہ پر گفتگو ہونے لگی۔ گویا خطرے کا ادراک کیا جانے لگا۔ متحدہ مجلس عمل کے سربراہ مولانا شاہ احمد نورانی نے بھی ایک بیان میں کہا کہ واقعی اسرائیل کا گریٹر اسرائیل کا منصوبہ ہے اور اس کا نقشہ میں نے منگایا ہے۔ اس میں مکہ اور مدینہ کو بھی اسرائیل کا حصہ دکھایا گیا ہے۔

کاش اس وقت ہمارے رہنماؤں نے اس آواز پر کان دھرا ہوتا جب بظاہر بالکل نارمل حالات میں اس خطرے کی نشاندہی نصف صدی پہلے کی گئی تھی۔ لیکن ہمارا مزاج بھی تو اب یہی بن گیا ہے کہ جب تک پانی سر سے اوپر نہیں گزر جاتا ہمیں خطرے کی سنگینی کا احساس نہیں ہوتا۔

تیسری بات عالمی صورتحال کو آسمانی اور بعض دینی کتب میں مذکور پیشین گوئیوں کی روشنی

میں دیکھنے کی کاوش تھی۔میں نے اپنے کالم ''عراق پر اینگلو امریکن حملہ''(۳۰ مارچ ۲۰۰۳ء) کے آخر میں مذہبی حوالے سے لکھا تھا کہ اگر شام کو اس کھیل میں ملوث کیا گیا تو عالمی جنگ چھڑ جائے گی۔میں نے واضح طور پر مذہبی پیشین گوئیوں کی بنیاد پر اس خدشہ کا نہیں بلکہ یقین کا اظہار کیا تھا۔یہ کالم ۳۰/مارچ کو آن لائن ہوا۔میں اس کی اطلاع جن بعض احباب کو ای میل سے دیا کرتا ہوں ان میں اے آر وائی چینل کے معروف پریزینٹر ڈاکٹر شاہد مسعود بھی شامل ہیں۔چنانچہ اس کالم کی اشاعت کے اگلے ہی دن یعنی ۳۱/مارچ ۲۰۰۳ء کو رات کو اپنے پروگرام ویوز آن نیوز میں ڈاکٹر شاہد مسعود نے ڈاکٹر اسرار احمد سے اس موضوع پر گفتگو کی کہ حالاتِ حاضرہ کے بارے میں قرآن وحدیث سے کیا خبر ملتی ہے؟۔مجھے یہ پروگرام دیکھ کر خوشی ہوئی کہ میرے ایک نکتہ نے ایک اہم پروگرام کے پیشکار کو فوری طور پر متوجہ کیا۔لیکن ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اصل موضوع پر کوئی اہم بات نہیں کر سکے۔شاید وہ اس حوالے سے کوئی تیاری نہیں کر سکے تھے اور اس موضوع کو اس زاویے سے دیکھ بھی نہیں رہے تھے۔چنانچہ میں نے اگلے روز ہی نیا کالم لکھا ''موجودہ حالات اور مذہبی پیشگوئیاں''۔اس میں وہ بیشتر حوالے درج کر دیئے جو آج کے حالات اور مزید آنے والے ایام کی نشاندہی کرتے ہیں۔یہ کالم ۳/اپریل ۲۰۰۳ء کو اردوستان پر آن لائن ہوا۔

یہ حوالے آج بھی ایسی پیشگوئیوں سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے مزید غور کا سامان فراہم کرتے ہیں۔بہرحال ان تین مثالوں سے یہ بتانا مقصود ہے کہ حالات کے شدید دباؤ کے باعث وقتی طور پر سہی، میں نے جو کچھ لکھا ہے، میرا نام لئے بغیر سہی لیکن کسی نہ کسی رنگ میں بڑی سطح پر اس کا نوٹس لیا گیا ہے۔اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے سرکاری اور غیر سرکاری پروپیگنڈے کے باوجود پاکستان کے عوام، عام لوگ اپنے طور پر درست نتائج اخذ کرنے اور حالات کی کنہ کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ہاں حالات وواقعات کی قومی سطح ہو یا بین الاقوامی سطح ہو، بے بسی ہمارا مقدر ہے۔میرے یہ کالم دکھ اور بے بسی کی کیفیت میں گھرے ہوئے ایک عام پاکستانی کے خیالات کا اظہار ہیں۔اور بس!

**حیدر قریشی**
ای میل:haider_qureshi2000@yahoo.com
(جرمنی سے)



# ہماری اجتماعی غلطیاں

پاکستان اس وقت کن مشکلات سے دوچار ہے۔ہمارے اندرونی اور بیرونی خطرات کتنی سنگین صورت اختیار کر چکے ہیں؟ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ملک کے بیشتر اہم صحافی اور مقتدر دانشور حضرات اس حوالے سے مسلسل لکھ رہے ہیں اور اپنے اپنے دائرۂ کار میں قوم کو درپیش خطرات سے آگاہ کرنے کے ساتھ ان سے نمٹنے کے لئے ممکنہ مشورے بھی دے رہے ہیں۔اسی حوالے سے میں کوشش کروں گا کہ بعض ایسے امور کو سامنے لاؤں جن کی طرف یا تو ابھی دھیان نہیں دیا گیا یا پھر بہت کم دھیان دیا گیا ہے،لیکن میرے نزدیک ان کی اہمیت نسبتاً زیادہ ہے۔

اپنی مشکلات کو دور کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اپنی ان غلطیوں پر بھی غور کیا جائے جن کے باعث نوبت یہاں تک پہنچی۔اس وقت ایک بات بالکل سامنے کی ہے کہ امریکہ دنیا کی واحد سُپر پاور بن کر سامنے آچکا ہے۔جب تک سوویت یونین روس قائم تھا اُس وقت تک امریکہ کو کبھی اس کی جرأت نہیں ہوئی تھی کہ کسی ملک پر اس طرح چڑھ دوڑے جیسے وہ پہلے عراق پر اور اب افغانستان پر چڑھ دوڑا ہے۔اور بات یہیں پر ختم نہیں ہو رہی۔۔۔کبھی تین،کبھی سات اور کبھی ستّر ممالک کی سرکوبی کی باتیں بھی سرِ عام کی گئی ہیں اور ایٹمی حملے کی دھمکیاں بھی سنا دی گئی ہیں۔اور تاحال چین اور روس کی طرف سے دبی دبی سی اور معذرت خواہانہ مذمت کے باوجود امریکہ کو چیلنج کرنے والا کوئی دکھائی نہیں دے رہا۔یہی وجہ ہے کہ امریکہ جو ڈپلومیٹک اور سیاسی سطح پر گزشتہ

نصف صدی سے پاکستان کے اندر موجود تھا اب اپنی افواج بھی پاکستان کے اندر لے آیا ہے۔ امریکی افواج دیگر عرب ممالک میں پہلے ہی سے براجمان ہیں۔ بلکہ عرب ممالک میں تو ان امریکی افواج کا سارا خرچہ بھی عربوں کے سر پر ہے۔

میں سمجھتا ہوں اگر امریکہ ایسا کر رہا ہے تو اُس کے اپنے قومی مفاد میں یہ اُس کا حق ہے۔ اگر ہم دنیا کی واحد سپر پاور ہوتے تو شاید ہم بھی ایسا ہی کرتے۔ اس لئے مسئلہ امریکہ کی مذمت کا نہیں بلکہ اپنی اُن غلطیوں کی طرف توجہ کرنے کا ہے جن کے باعث ہمیں آج یہ دن دیکھنا پڑا۔

گزشتہ پچاس سال کی پاکستان کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجئے۔۔ ہماری بیشتر سیاسی اور مذہبی جماعتوں نے امریکہ کے مقابلہ میں سوویت یونین روس کو نہ صرف نظر انداز کیا بلکہ اسے اپنا شدید سیاسی اور سیاسی سے زیادہ دینی حریف گردانا۔ کیمونسٹ روس کو خدا کا منکر اور دہریہ قرار دے کر اس کے خلاف عوام میں نفرت کی فضا پیدا کی گئی۔ روس کے بارے میں معتدل یا دوستانہ رویہ رکھنے والے سیاستدانوں کو ملک دشمن اور غدار کہا جاتا رہا۔ ان کے خلاف کفر کے فتوے جاری کئے جاتے رہے۔ روس دشمنی کے لئے تقریباً تمام دینی جماعتیں حسبِ توفیق کام کرتی رہیں۔ جس سے عوام میں روس کے خلاف نفرت بڑھتی رہی۔ اس سے سیاسی طور پر امریکی گرفت پاکستان پر مسلسل مضبوط ہوتی رہی۔

پھر اس وقت یہ نفرت انتہا کو پہنچ گئی جب سوویت یونین نے ایک بڑی سیاسی غلطی کرتے ہوئے افغانستان میں اپنی فوجیں داخل کر دیں۔ امریکہ نے تب روس کے خلاف اس نفرت کو بھرپور طریقے سے کیش کرایا۔ ایک طرف پاکستان کو جہاد افغانستان کے نام پر متحرک کیا گیا۔ دوسری طرف بیشتر عرب ممالک سے بھی مجاہدین منگائے گئے۔ افغان عوام کو روس کے خلاف بھڑکایا گیا۔ تب سارا عالمِ اسلام سوویت یونین کے کیمونزم کی دشمنی میں جہاد افغانستان کے نام پر امریکی مفادات کے لئے آلۂ کار بن کر رہ گیا۔ اُس وقت اگر خان عبدالولی خان جیسے چند سیاسی رہنماؤں نے ایسے بیان دیئے کہ افغانستان میں کوئی جہاد نہیں ہو رہا ہے بلکہ امریکی مفادات کا کھیل چل رہا ہے۔۔۔۔ امریکہ جہاد کے نام پر مسلمانوں کو بے وقوف بنا رہا ہے اور صرف اپنے مقاصد کے لئے استعمال کر رہا ہے۔ تب ایسی ساری باتوں کے جواب میں خان عبدالولی خان کو اوران جیسے دوسرے لوگوں کو حسبِ معمول غدار اور اسلام دشمن اور ملک دشمن کہہ کر چُپ کرا دیا گیا۔



شدید پروپیگنڈہ کر کے روسی افواج کے افغانستان میں داخلے کے بارے میں یہ باور کرایا جاتا رہا کہ افغانستان کے بعد پاکستان ہی روس کا نشانہ بنے گا۔

جنرل ضیاء الحق کو اسی بہانے ملک سے جمہوریت کا جنازہ نکالنے اور اپنا اقتدار مستحکم کرنے کا موقعہ مل گیا۔ ہم جمہوری روایات سے بے بہرہ ہوتے چلے گئے اور پھر نجی مفادات کی ایک دوڑ چل نکلی جس کے نتیجہ میں غریب، غریب تر ہوتا گیا اور امیر امیر تر۔۔۔۔۔ جس ''اسلام'' کو کیمونسٹ روس سے شدید خطرہ تھا اس ''اسلام'' کو ان سماجی ناانصافیوں اور بڑھتی ہوئی طبقاتی خلیج سے کوئی خطرہ نہیں محسوس ہو رہا تھا، حالانکہ دینِ اسلام تو سب سے پہلے اپنے شہریوں کی بنیادی ضروریات پوری کرنے کا فلاحی نظام پیش کرتا ہے۔ بہر حال ایک طرف جنرل ضیاء الحق جیسے فوجی کا ذاتی اقتدار مستحکم ہو رہا تھا، دوسری طرف عرب ممالک کے شیوخ اور شاہ اپنی شاہانہ رونقوں میں مگن تھے اور امریکہ نے ان سب کی دفاعی ذمہ داریاں سنبھال رکھی تھیں۔ ان سب کی حفاظت کا ذمہ لے رکھا تھا۔

ایسے حالات میں سوویت یونین روس ٹوٹ گیا۔ امریکہ نے ایک ایسی جنگ جیت لی جس کا اس نے کبھی خواب بھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ جنگ امریکہ نے افغانیوں، پاکستانیوں اور عالمِ اسلام کی بھرپور مدد سے بلکہ ان کی قربانیوں کی بدولت جیتی تھی۔ اور پاکستان کو اس کا صلہ یہی ملا کہ ملک کلاشنکوف کلچر اور ہیروئن کلچر کی لپیٹ میں آ گیا۔ امریکی مفادات کے تحفظ کے نتیجہ میں ملک کے اندر پیدا ہونے والے اسی کلچر کو اب خود امریکہ ''دہشت گردی'' قرار دے کر ہمیں موردِ الزام ٹھہرا رہا ہے۔ سو جب امریکہ کو سوویت یونین کا کوئی خوف نہ رہا تو پھر افغانیوں اور پاکستانیوں کے ساتھ اس سے بھی زیادہ ناروا سلوک کیا جو عام طور پر ''ٹشو پیپر'' سے کیا جاتا ہے۔ اور اب امریکہ پاکستان، افغانستان اور سارے عالمِ اسلام کے ساتھ جو کچھ کر رہا ہے وہ تو ایک نئی تاریخ بن رہی ہے۔ وہ تاریخ جسے پہلے ہی امریکی دانشور ''تاریخ کے خاتمے'' سے تعبیر کر چکے ہیں۔ یہ ایک الگ موضوع ہے۔

اب مسئلہ امریکہ کو برا بھلا کہنے سے حل ہونے والا نہیں ہے۔ امریکی قوم کی اپنی ترجیحات ہیں، اپنے مفادات ہیں۔ ہمیں پہلے تو یہ مان لینا چاہئے کہ بے شک روس کے افغانستان میں داخلے نے پاکستان کے لئے عدم سلامتی کے خدشات کو جنم دیا اس کے باوجود اگر افغانستان میں

امریکی مفادات کے لئے لڑی جانے والی جنگ کو بے جا طور پر جہاد کا رنگ نہ دیا جاتا، تو تب کم از کم اتنے بُرے حالات تو نہ ہوتے۔اس وقت دیکھا جائے تو پاکستان، افغانستان اور سارا عالمِ عرب ایک طرح سے امریکہ کے رحم وکرم پر ہیں۔ اس اجتماعی غلطی میں روس خود بھی تباہ ہو گیا مگر ہمارے لئے اہم تو اپنی بربادی کے محرکات پر توجہ دینا ہے. قوموں کو اپنے ایک لمحے میں کئے ہوئے کسی غلط فیصلے کی قیمت بعض اوقات صدیوں کی صورت میں ادا کرنا پڑتی ہے۔ہم نے تو پوری آدھی صدی، اپنے ملک کی پوری تاریخ میں اپنے ملکی مفادات کے حوالے سے اور بالخصوص امریکہ کے حوالے سے اتنے غلط فیصلے کئے ہیں کہ ان کا خمیازہ اب کم از کم اگلی نصف صدی تک تو بہر حال بھگتنا ہوگا۔ہاں ایسا ہو سکتا ہے کہ ہم اب موجودہ امریکی شکنجے میں رہتے ہوئے اپنے وہ احوال درست کر سکیں جن کی طرف ہم پہلے توجہ نہیں دے سکے۔

☆☆☆



# اختلافِ عقیدہ کی بنیاد پر نفرت کیوں؟

پاکستان میں مذہبی فسادات کا سلسلہ کب سے شروع ہوا اور کیسے ''طالبان'' عہد تک پہنچا۔اس سلسلے میں سامنے کی بات یہ ہے کہ ۱۹۵۲ء میں اینٹی احمدیہ تحریک اس کا نقطۂ آغاز تھی۔اس موقعہ پر جو تحقیقاتی کمیشن حکومت پاکستان کی طرف سے مقرر کیا گیا تھا اُس میں بعض بے حد اہم علماء نے اقلیتوں کے تیئں اپنے تعصّبات کو کھل کر بیان کر دیا۔مثلاً اس عہد کے ایک مقتدر عالِم دین مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب سے جب فاضل عدالت نے یہ سوال کیا کہ آپ جو سلوک پاکستان میں اقلیتوں کے ساتھ کرنا چاہتے ہیں، اگر ہندوستان میں ہندو اکثریت ویسا ہی سلوک وہاں کی مسلم اقلیت کے ساتھ کرے تو کیا آپ کو کوئی اعتراض ہوگا؟

تب مولانا مودودی نے جواب دیا کے بے شک وہاں کی ہندو اکثریت مسلمانوں کے ساتھ ملیچھوں اور شودروں جیسا سلوک کرے، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔مولانا کا یہ ''تاریخی جواب'' اپنے اصل الفاظ کے ساتھ منیر انکوائری رپورٹ میں درج ہے۔اب اس بیان کی روشنی میں آج کے ہندوستان کے مسلم کش فسادات کو دیکھا جائے تو ایسے لگتا ہے جیسے انڈیا کے انتہا پسند ہندوؤں کو ہمارے انتہا پسند علماء نے ہی ایسے ہولناک اور خونریز فسادات کرنے کا سرٹیفکیٹ دے دیا

تھا۔جس پر وہ وقتاً فوقتاً عمل کرتے رہتے ہیں۔

انڈیا سے قطع نظر اینٹی احمدیہ تحریک کے بعد ایک عرصہ تک پاکستان فرقہ وارانہ لڑائی جھگڑوں سے پاک رہا۔ذوالفقار علی بھٹو کے دورِ اقتدار میں جب مئی ۱۹۷۴ء میں ربوہ ریلوے اسٹیشن پر نشتر میڈیکل کالج کے طلبہ کے ساتھ تصادم ہوا تو اینٹی احمدیہ تحریک ایک بار پھر زور پکڑ گئی۔ (عجیب اتفاق ہے کہ انڈیا میں گودھرا ریلوے اسٹیشن سے شروع ہونے والا اینٹی مسلم فساد، ربوہ ریلوے اسٹیشن کے تصادم سے بڑی حد تک مشابہہ ہے۔البتہ انڈیا کے فسادات ۔۔۔۔ پاکستان کے ربوہ تصادم سے اپنی ہولناکی اور وحشیانہ بربریت کے لحاظ سے حجم میں کہیں زیادہ ہیں) اس تحریک کے نتیجہ میں بعض علمائے اسلام نے ذوالفقار علی بھٹو کو یقین دلایا کہ احمدیوں کو سرکاری طور پر غیر مسلم اقلیت قرار دینے سے وہ پاکستان کے مقبول ترین لیڈر بن جائیں گے۔ چنانچہ بھٹو صاحب نے جماعت احمدیہ کو غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا۔لیکن وہ خود ملک کے مقبول ترین لیڈر نہ بن سکے۔جنرل ضیاء الحق نے انہیں تختہء دار تک پہنچایا اور اس ظلم میں وہ بیشتر علماء جنرل ضیاء الحق کے معاون رہے جو اس سے پہلے ذوالفقار علی بھٹو جیسے زیرک اور لبرل سیاستدان کو مقبولیت دوام کا یقین دلا چکے تھے۔

جنرل ضیاء الحق کا دور مذہبی دہشت گردی کے فروغ کا دور تھا۔افغانستان کے بدلے ہوئے سیاسی تناظر میں وہ امریکہ کی ضرورت بن گئے تھے اور امریکہ کے لئے بھی اُن حالات میں پاکستان میں مذہبی افکار کی انتہا پسندانہ روش فائدہ مند تھی۔چنانچہ محض اقتدار کو مضبوط رکھنے کے لئے جنرل ضیاء الحق نے مذہبی انتہا پسندی کو فروغ دیا۔نفرتوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع کرادیا۔کراچی میں ''ایم کیو ایم'' کے قیام سے جماعت اسلامی کی قوت کا ایک گڑھ ان سے چھن گیا۔شیعہ اور سنی فسادات کا نا ختم سلسلہ جنرل ضیاء الحق کے عہد میں شروع ہوا۔

جنرل ضیاء الحق نے ایک طرف کلاشنکوف اور ہیروئن کی لعنت ملک میں عام کرادی دوسری طرف فرقہ وارانہ نفرت کو اتنی ہوا دی کہ یہ نفرت اب ہیروئن اور کلاشنکوف دونوں کے مشترکہ اثرات سے بھی زیادہ ہلاکت خیز ہو چکی ہے۔بے شک پاکستان کی داخلی صورتحال سے فائدہ اٹھا کر کبھی کبھار انڈیا کی ایجنسیوں نے بھی چند دھماکے کرائے ہوں گے۔لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ نفرت کا یہ زہراب ہمارے پورے معاشرے میں ہیروئن کے نشے کی طرح انجیکٹ کر دیا گیا



ہے۔چنانچہ ہلاکت اور تباہی کے بیشتر نفرت انگیز مظاہرے ہمارا اپنا ہی کیا دھرا ہوتے ہیں۔

''طالبان'' نے جب افغانستان کا کنٹرول سنبھالا تو اپنے مسلک کے علاوہ باقی سارے مسلمان مسالک پر عملاً پابندی عائد کردی۔دوسرے مذاہب کا تو معاملہ ہی الگ ہے۔لیکن جب افغانستان پر امریکی بمباری ہوتی ہے تو وہ بم کسی مسلک کی شناخت نہیں کرتے۔بلا امتیاز ہر مسلک کے مسلمان کے لئے ہلاکت لا رہے ہیں۔اُدھر ہندوستان کے صوبہ گجرات میں ان دنوں میں ہندو مسلم فساد کے نام پر جو ہولناک ظلم ہوا ہے اس میں بھی کسی انتہا پسند ہندو نے کسی مسلمان کو زندہ جلاتے وقت یا شہید کرتے وقت اس سے اس کے مسلک کی بابت کچھ نہیں پوچھا۔اسرائیل نہتے فلسطینیوں پر گزشتہ پچاس برسوں سے جو ظلم اور بربریت کا مظاہرہ کر رہا ہے تو اس میں وہ کسی مسلک کی تفریق نہیں کر رہا۔جب مسلمانوں پر ظلم کرنے والے مسلک کی کسی تفریق اور تخصیص کے بغیر ظلم کرتے ہیں تو مسلمانوں کو کب ہوش آئے گا کہ وہ بھی اپنے فروعی اختلافات کی سطح سے اوپر اٹھیں اور خود کو فرقوں اور ٹکڑوں میں دیکھنے کے بجائے امت واحدہ بن جائیں۔

کیا آج کی ساری عالمی صورتحال ہم سب کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی نہیں ہے؟

برصغیر کے مسلمانوں کو خاص طور پر یاد رکھنا چاہئے کہ برصغیر میں اسلام کا فروغ نہ کسی مسلمان بادشاہ کے ذریعے سے ہوا نہ کسی انتہا پسند مولانا کے ذریعے سے ہوا۔جتنا اسلام پھیلا مسلمان ولیوں اور صوفیوں کے ذریعے سے پھیلا۔اولیاء اور صوفیاء نے ہمیشہ محبت کا درس دیا۔صرف مسلمانوں کے آپسی فرقوں ہی کے لئے نہیں،غیر مسلموں کے لئے بھی محبت کا درس دیا۔یہی محبت کا درس تھا جس نے اسلام کو برصغیر پاک و ہند میں اس حد تک پھیلا دیا جتنا ہمیں آج دکھائی دیتا ہے۔آج بھی لاکھوں ہندو اور سکھ اُن صوفیاء سے،اُن اولیاء سے عقیدت رکھتے ہیں، ان کے نام آتے ہی ان کی کدورتیں غائب ہو جاتی ہیں۔لیکن آج بجائے غیر مسلموں کو اسلام کی انسان دوست تعلیمات سے متاثر کرنے کے، پاکستان کے مذہبی انتہا پسندوں نے آپس ہی میں لڑنا شروع کر دیا ہے۔مذہبی عدم برداشت،عدم رواداری،اور مذہبی تشدد کے باعث آج ساری دنیا میں پاکستان کی شہرت کسی اور ہی طرح کی ہو کر رہ گئی ہے۔

وقت آ گیا ہے کہ تمام مسلمان فرقے بدلتے ہوئے عالمی نقشے کا ادراک کریں۔عالمِ اسلام کے حکمرانوں کی مجموعی بے حسی کی المناک صورت حال کو بھی مدّنظر رکھیں اور آپسی

اختلافات کوفروعی اختلاف کی حد تک رکھ کر باہمی نفرتوں کا خاتمہ کرنے اور باہمی محبت کوفروغ دینے کے لئے نیک نیتی کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوں۔ یہ اختلافات ختم کرنے کے آخری لمحات ہیں۔ اگر ابھی بھی قوم نے آنکھیں نہ کھولیں تو پھر شاید اسے اپنی اب تک کی مذہبی لڑائیوں کی تلافی کرنے کا کوئی موقعہ نہیں مل سکے گا۔ کیونکہ آنے والے وقت کی تاریخ اپنے پورے بہاؤ کے ساتھ آرہی ہے۔

وقت قوموں کو ایک حد تک مہلت دیتا ہے۔ اور ہم اس حد کے قریب آچکے ہیں!

☆☆☆



# مغرب، مشرق اور افغانستان

مشرق اور مغرب کے سیاسی تناظر میں بہت کچھ لکھا جارہا ہے اور ہمارے مشرقی نکتۂ نگاہ سے ایسا سارا لکھا ہوا بے حد صائب بھی ہے۔ میں یہاں سیاسی تناظر سے پہلے مغربی معاشرے کے اُس ذہنی پس منظر کے حوالے سے بات کروں گا جو ہمارے موجودہ ذہنی ٹکراؤ کا سبب بنا ہوا ہے۔ پھر تھوڑا سا سیاسی حوالے سے بھی بات کروں گا۔

مغربی ممالک کے بارے میں ہم لوگوں کا تاثر ہمارے اپنے ذہنی پس منظر سے بنا ہے اور ہمارے بارے میں مغربی ممالک کا تاثر اُن کے اپنے ذہنی پس منظر سے تعمیر ہوا ہے۔ مغربی ممالک کے بارے میں ہم اگر انسانی تاریخ کے حوالے سے ایک سرسری جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے گرم ممالک کے مقابلہ میں ان ٹھنڈے یخ ممالک کے انسانوں کو ابتدائی انسانی زندگی میں شدید ترین مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ شدید ترین گرمی کے مقابلہ میں شدید ترین سردی کو برداشت کرنا زیادہ مشکل ہے۔ مغربی ممالک کے انسان کو ایسے ہی مشکل ترین ماحول سے گزر کر موجودہ عہد کی پُر آسائش زندگی نصیب ہوئی ہے۔ اس دوران خود یورپ نے پوپ کی حد سے زیادہ مذہبی دخل اندازی سے تنگ آکر ایک طویل سیاسی جدوجہد کی جس کے نتیجہ میں خاصا خون خرابہ ہوا لیکن آخر پوپ کو ویٹی کن سٹی تک محدود کیا گیا اور اس حد میں اسے سارا مذہبی احترام دے کر مسیحیت کی ترویج اور انسانیت کی فلاح کے کام کرنے کے لئے بہت سارا اختیار دے دیا گیا۔

اُدھر امریکہ میں جب جمہوری عمل کی نشوونما ہونے لگی تو وہاں کے مسیحی مذہبی حلقوں نے ان تبدیلیوں کو اپنے مذہب کے خلاف قرار دیتے ہوئے ان کی مزاحمت کرنا شروع کی۔ تب مذہبی

حلقوں اور دانشور طبقے میں شدید ٹکراؤ ہوا۔Fundamentalist (مذہبی بنیاد پرستی) کی اصطلاح سب سے پہلے خود امریکہ کے مذہبی انتہا پسند طبقے کے خلاف استعمال کی گئی اور ایک عرصہ تک امریکہ میں اس کا بڑا چرچا رہا۔اب جو ہمارے انتہا پسند علماء کے سلسلے میں یہ اصطلاح استعمال کی جا رہی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ صرف مسلمانوں کے مذہبی لیڈروں اور ان کے پیروکاروں کے لئے گھڑی گئی ہے۔ یہ وہی اصطلاح ہے جسے وہ اس سے پہلے خود اپنے مذہبی انتہا پسندوں کے خلاف استعمال کر چکے ہیں۔

یورپ اور امریکہ کے عوام کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کو اپنے ڈھنگ سے جینا چاہتے ہیں۔اس کے لئے کسی اور کے مذہب کا تو ذکر ہی کیا وہ خود اپنے مذہب کی پابندی کرنا زیادہ ضروری نہیں سمجھتے۔بس ایک معاشرتی حد تک مذہب ان کی ضرورت ہے،اس سے زیادہ نہیں۔ایک طرف اہلِ مغرب کا زندگی کی طرف عمومی رویہ ایسا ہے تو دوسری طرف ان کے دینی اسکالرز نے اسلام کے بارے میں کچھ دانستہ اور کچھ نادانستہ ایسی غلط فہمیاں پیدا کی ہیں جو ان لوگوں کے ذہنوں سے چپک کر رہ گئی ہیں۔پھر مشرقی ثقافت سے مغربی عوام دیکھنے کی حد تک تو لطف لیتے ہیں لیکن اس کے سماجی بندھنوں کو وہ جکڑ بندیاں سمجھتے ہیں۔ اور انہیں ایسی زندگی گزارنے کے تصور سے بھی خوف آتا ہے۔اب جن لوگوں نے اپنے انتہائی قابلِ احترام پوپ کو بھی ایک کونے میں بٹھا دیا ہو۔اپنی زندگی سے مذہب کے بہت زیادہ عمل دخل کو ختم کر دیا ہو اور نجی آزادی کو اہمیت دی ہواُن کے سامنے مشرقی معاشرت یا کسی اور مذہب کی طالبان جیسی سختی کے ساتھ پابندی انہیں حد سے زیادہ خوفزدہ کر دیتی ہے۔اسی لئے ان کے نزدیک ایسی معاشرت کے علمبردار بنیاد پرست ہیں۔

یہ میں نے ابھی تک مغربی معاشرے کے حوالے سے بات کی ہے۔ جہاں تک سیاسی زاویے سے دیکھنے کی بات ہے، میں مغربی ملکوں کو اس حد تک تو فلاحی جمہوری مانتا ہوں کہ یہاں ہر انسان کو زندگی کی بنیادی ضروریات فراہم کی جاتی ہیں۔ان کے سیاسی اور سماجی حقوق کا احترام کیا جاتا ہے۔سماجی انصاف کی فراہمی عمومی طور پر خوش کن ہے۔لیکن اگر اس جمہوریت کو غور سے دیکھا جائے تو یہ سرمایہ دارانہ جمہوریت کا نظام ہے۔بے شک پہلے یہاں جمہوریت عوام کی سطح سے شروع ہوئی لیکن رفتہ رفتہ اسے یہاں کے سرمایہ داروں اور صنعتکاروں نے اپنے قابو میں کر



لیا۔اب یہاں کے بڑے بڑے صنعتکار اور ان کے نمائندے ہی پارلیمنٹوں تک پہنچ پاتے ہیں۔صنعتی مفادات کا ایک سلسلہ ہے جو اِن معاشروں میں جاری و ساری ہے۔ چونکہ عوام کی اکثریت کو ان کی بنیادی ضروریات آسانی سے فراہم کر دی جاتی ہیں اس لئے عوام کو خود اقتدار میں اس حد تک شریک ہونے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی کہ وہ بھی پارلیمنٹ تک پہنچ پائیں۔ہم جمہوری روایات سے زیادہ بہرہ ور نہیں ہیں اس کے باوجود الیکشن کے دنوں میں ہمارے ہاں جو رونق میلہ ہوتا ہے،مغربی ممالک میں ہونے والے انتخابات میں اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں دیکھا جاتا۔اس لحاظ سے اگر کہا جائے کہ مغربی ممالک میں سرمایہ دارانہ اور صنعتی نظام کی سرپرست جمہوریت پھل پھول رہی ہے تو یہ بے جا نہ ہوگا۔

اسی سرمایہ دارانہ اور ملٹی نیشنل کمپنیوں کے جمہوری نظام نے اب دنیا کے ہر اُس خطے پر نظر رکھی ہوئی ہے جہاں اُنہیں سرمایہ میں غیر معمولی اور پُرکشش اضافے کا امکان دکھائی دے رہا ہے۔دولت کے یہ انبار انہیں عرب ممالک کے تیل کے خزانوں کے ذریعے سے ملیں یا افغانستان کے رستے سے سابقہ سوویت یونین کی بعض سابقہ ریاستوں سے ملیں،انہوں نے وہاں تک لازماً رسائی حاصل کرنا ہے۔

مغربی ممالک کے عوام کے دلوں میں اسلام سے متعلق ایک نفرت آمیز خوف مسیحی علماء نے صدیوں سے پیدا کر رکھا ہے۔مغربی طرزِ زندگی بھی وہاں کے عوام کے لئے اسلام سے ذہنی دوری کا باعث ہے۔تاہم مغربی سیاستدانوں کو تب سے اسلام سے شدید خوف محسوس ہونے لگا ہے جب سے انہوں نے سوویت یونین کی شکست وریخت کا منظر دیکھا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ مغربی ممالک کی طرف سے اسلحہ کی فراہمی نہ ہوتی، بھرپور اقتصادی اور سیاسی امداد نہ ہوتی تو افغانستان محض عرب ممالک اور پاکستان کے تعاون سے کبھی بھی سوویت روس نواز حکومت کو ہٹا نہیں سکتا تھا۔امریکہ کے پیشِ نظر تو صرف اتنی سی بات تھی کہ اسے ویت نام میں جو شدید ہزیمت اٹھانا پڑی تھی کچھ ویسی ہی ہزیمت روس کو مل جائے۔۔۔۔اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس جدوجہد میں جسے تب امریکہ خود بڑے طمطراق سے ''جہاد'' قرار دیتا رہا،اس سے سوویت یونین کے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ جب ایسا ہو گیا تب پہلے تو امریکہ تھوڑا سا خوشی کے نشے میں رہا لیکن جلد ہی اس کا نشہ ان لوگوں کے جذبۂ جہاد کے خوف سے ہرن ہو گیا۔اس خوف کی جو بھی نفسیاتی

توجیہات کر لی جائیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ امریکہ کا یہ خوف ہی اسلام کے خلاف محاذ آرائی کا سبب بن گیا۔مزید اتفاق یہ ہوا کہ امریکی ملٹی نیشنل کمپنیوں کے پُرکشش مالی مفادات بھی اِنہیں اسلامی خطوں سے وابستہ تھے۔یوں امریکہ نے افغانستان میں جو کچھ کیا اور جو کچھ ابھی اس نے کرنا ہے اس میں اسے اپنے نفسیاتی ''اسلامی خوف'' سے نجات کے ساتھ اپنے مفادات بھی سمیٹنے ہیں۔

مغربی ممالک کے عوام جو پہلے سے اپنے مذہبی رہنماؤں سے چھٹکارا حاصل کر چکے تھے۔ان کے لئے جب مغربی میڈیا نے ''اسلامی بنیاد پرستی'' کا ہوّا کھڑا کیا تو وہ فوراً اس پروپیگنڈہ کے زیرِ اثر آ گئے۔عمومی طور پر اس وقت مغربی ممالک کے باشندے اسلام فوبیا میں مبتلا ہیں۔ مغربی میڈیا دن بدن اس فوبیا کو بڑھا رہا ہے۔اس حوالے سے جب میں ایک عام پاکستانی اور ایک مغربی باشندے کا ذہنی تجزیہ کرتا ہوں تو میں یہ بات ایمانداری سے لکھ رہا ہوں کہ ہمارے ایک عام شہری کی سیاسی سوچ اور بصیرت مغربی ممالک کے عام شہریوں سے کہیں بہتر اور اِن کا واقعات کو سمجھنے کا تجزیہ سرکاری پروپیگنڈے کے باوجود اِن کے اپنے ذہن کا زائیدہ ہوتا ہے۔جبکہ مغربی عوام زیادہ تر اپنے میڈیا ہی پر انحصار کرتے ہیں۔

''طالبان'' نے دین اسلام اور اس کی تشریح کے حوالے سے بعض انتہائی فاش قسم کی غلطیاں نہ کی ہوتیں اور اپنے مسلک کو کٹڑ پن کی حد تک نہ لے گئے ہوتے تو شاید افغانستان کو اتنی بڑی تباہی کا شکار ہونے سے بچایا جا سکتا۔تاہم طالبان کی سیاسی اور مذہبی فیصلوں کی کئی غلطیوں کے باوجود امریکہ اور برطانیہ نے افغانستان پر جو ظلم توڑا ہے وہ تاریخ انسانیت کا ایک سیاہ ترین باب ہے۔یہ جاننے کے باوجود بھی کہ کوئی اسلامی ملک اس کے سامنے پر نہیں مار سکتا،امریکہ نے جن اسباب کے تحت بھی افغانستان میں جو کچھ کیا ہے،اس سے ایک بات تو بہر حال ثابت ہو گئی ہے کہ انسان مادی ترقی کی دوڑ میں کتنا ہی عظیم،کتنا ہی ترقی یافتہ۔۔اور کتنا ہی مہذب ہو جائے،اس کے اندر کا وحشی درندہ کبھی نہیں مرتا اور ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' کا قانون ہی اصل سچائی ہے۔

امریکہ نے اس سچائی کو اکیسویں صدی میں پھر سے ثابت کر دیا ہے!

☆☆☆



# تہذیبوں کا ٹکراؤ

حالیہ دنوں میں پاکستان اور مغرب کے بعض دانشور حلقوں کی جانب سے اسلامی اور مغربی تہذیبوں کے ٹکراؤ کی باتیں کی گئی ہیں۔اس کے پس منظر میں امریکی صدر جونیئر بُش کا وہ بے اختیاری بیان تھا جو انہوں نے اس عہد میں صلیبی جنگوں کے حوالے سے دیا تھا۔یہ سوچا سمجھا بیان تھا یا غم وغصہ کی حالت میں کہی گئی بات تھی لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ انتہائی غیر ذمہ دارانہ بیان تھا جو امریکہ کے صدر کے منصب کے وقار سے گرا ہوا تھا۔اسی بیان کے پیش نظر میں یہاں تہذیبی ٹکراؤ کے بعض پہلوؤں،اور بعض امکانی گنجائشوں کے حوالے سے کچھ عرض کروں گا۔

اگر امریکہ نے اسامہ بن لادن اور طالبان کے نام کی آڑ لے کر اور ٹریڈ سنٹر پر ہوائی جہازوں کے حملے کو بہانہ بنا کر افغانستان کی سرزمین اور وہاں کے عوام کے لئے جہنم کا دہانہ کھول دیا ہے تو یہ کوئی تہذیبی ٹکراؤ نہیں ہے۔یہ کوئی صلیبی جنگ نہیں ہے۔لیکن اگر یہ تہذیبی ٹکراؤ ہے اور صلیبی جنگ ہے تو اپنی تمام تر تباہ کاریوں کے ارتکاب کے باوجود امریکہ کے لئے یہ جنگ ہارنے کا امکان زیادہ ہے۔

اگر عام نظر سے دیکھا جائے تو تہذیبی سطح پر مغربی دنیا بالخصوص امریکہ اور برطانیہ کی سیٹلائٹ تہذیب صرف اسلامی دنیا پر ہی نہیں مشرق کے ایک بڑے حصے پر غالب آ چکی تھی اور مزید غالب آتی چلی جا رہی تھی۔اس سلسلے میں سامنے کی مثالیں یہ ہیں کہ سیٹلائٹ کے اس دور

میں امریکی اور برطانوی میڈیا ہمارے اسلامی اور مشرقی ممالک میں ایک خاص اہمیت کر چکا تھا۔اس کے اثرات ہماری فلموں،ٹی پروگرامز سے لے کر ہماری عام زندگی تک گہرے ہوتے چلے جا رہے تھے۔ہم اپنے میڈیا کی اطلاعات کے مقابلہ میں امریکی اور برطانوی میڈیا کی اطلاعات پر زیادہ بھروسہ کرتے تھے اور غیر محسوس طریقے سے مغربی تہذیب کی چکا چوند کے زیر اثر آتے چلے جا رہے تھے۔گلوبل کلچر کی ایک نامکمل سی شکل بھی بننے لگی تھی۔پورے انسان کی بات کرنے والے نیک نیتی سے خوش تھے کہ اس کرۂ ارض پر سارے انسان کسی نسلی، قومی، مذہبی، رنگت کے فرق یا کسی اور فرق کی بنیاد پر نہیں بلکہ انسان ہونے کی بنیاد پر پہچانے جائیں گے۔اس طریقے سے اگر دیکھا جائے تو خود امریکی اور اس سے منسلک دوسرے ممالک کی تہذیب ہی غالب آتی جا رہی تھی۔امریکہ واضح طور پر کسی خون خرابہ کے بغیر تہذیبی جنگ میں فتح یابی کی طرف گامزن تھا۔ایک ایسی امریکی تہذیب فتح حاصل کر رہی تھی جس کے خود اپنے تہذیبی خدوخال ''تہذیب'' کے کسی بڑے پیمانے پر پورے نہیں اترتے تھے۔

لیکن جیسے ہی امریکہ نے افغانستان پر اسامہ بن لادن کے بہانے سے شدید حملہ کیا،خون خرابہ کرنے کے باوجود امریکہ تہذیبوں کی جنگ میں بہت پیچھے آ گیا ہے۔فلسطینیوں پر یہودی حکومت کے وحشیانہ حملوں نے اس تہذیبی جنگ میں امریکی شکست کے امکانات کو مزید واضح کر دیا ہے۔اس بارے میں کوئی شک نہیں کہ اسرائیل جو کچھ فلسطینیوں کے ساتھ کر رہا ہے، وہ مکمل طور پر امریکی حمایت کے بعد کر رہا ہے۔پھر بھارت کے صوبہ گجرات کے انتہا پسند ہندوؤں کے عام اور مظلوم مسلمانوں پر وحشیانہ حملوں کے بارے میں امریکی حکومت کا ڈپلومیٹک انداز۔۔یہ سب شاید اسی تہذیبی ٹکراؤ کا حصہ ہیں۔اسی کے نتیجہ میں پوری اسلامی دنیا کے عوام میں اسلامی تہذیب کے تحفظ کا وہ احساس بیدار ہونے کی امید ہے جو ایک عرصہ سے خود مغربی میڈیا کی سحر کاری میں کہیں سو کر رہ گیا ہے۔اسی لئے میں نے لکھا ہے کہ اگر امریکہ نے تہذیبی ٹکراؤ شروع کیا ہے تو اس نے خود اپنی اس جیت کو شکست کی راہ پر ڈال دیا ہے۔اسلامی تہذیب اور مشرقی تہذیب کی وسعت اور پھیلاؤ کے سامنے امریکی تہذیب جو اپنے تہذیبی عقب میں کسی قدیم ثقافت کے ثمرات سے بھی محروم ہے، کوئی معنی ہی نہیں رکھتی۔خیال رہے کہ بات ملکوں کی نہیں تہذیبوں کی ہو رہی ہے۔



افغانستان پر امریکی تسلط سیاسی طور پر اور معاشی طور پر بھی اس کے لئے نقصان کے سوا کچھ نہیں لائے گا۔سوویت یونین روس کی جن سابقہ ریاستوں سے اس نے تیل کے ذخیرے نکال کر لانے ہیں ان کے لئے افغانستان پر اس کا مکمل کنٹرول ہونا یا پھر افغانستان میں مکمل امن و امان کا قائم ہونا بے حد ضروری ہے۔یہ دونوں امور امریکیوں کے بس میں نہیں ہیں۔افغانیوں کا جتنا خون بہالیں،ان کی مرضی کے خلاف امریکہ وہاں کچھ بھی نہیں کر پائے گا۔یوں اس جنگ میں ''افغانیوں کے خون سے غسل کرنے'' کے سوا امریکہ کو نہ کوئی کامیابی ملی ہے نہ اس طریقے سے کوئی کامیابی مل سکتی ہے۔اس کے تہذیبی، سیاسی اور اقتصادی مقاصد ابھی تک پورے نہیں ہوئے اور نہ ہی اس طریقے سے پورے ہو سکتے ہیں جو امریکہ نے اختیار کر رکھا ہے۔

تہذیبی ٹکراؤ میں صرف فوجی قوت ہی کام نہیں کرتی۔اس میں حملہ آور تہذیب کا اپنا تہذیبی سرمایہ بھی بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔چونکہ امریکہ کے پاس نہ ایسا کوئی تہذیبی سرمایہ ہے اور نہ صلیبی جنگ کے نعرے میں کوئی جان تھی اسی لئے امکان غالب یہی ہے کہ امریکہ اپنی تہذیبی اور صلیبی دونوں جنگیں ہار سکتا ہے۔ہاں ظلم اور زیادتی کی جنگ ابھی وہ جیت سکتا ہے۔اور جیت رہا ہے۔

افغان عوام ہوں، مجبور اور بیکس فلسطینی ہوں، انڈیا کے مقہور مسلمان ہوں یا تیسری دنیا کے سارے مظلوم عوام۔۔ان کے دلوں میں امریکہ کے لئے نفرت گہری ہوتی جا رہی ہے۔جو لوگ اپنے سینوں پر بم باندھ کر ذلت کی زندگی پر عزت اور وقار کی موت کو ترجیح دیتے ہوں اور جو جان کو خدا کی امانت سمجھ کر ہتھیلی پر لئے پھرتے ہوں، امریکہ ایسے لوگوں پر فتح حاصل کرنے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا۔اگر فتح دلوں کو جیتنے سے ہوتی ہے تو شاید اس وقت دنیا میں سب سے بڑا شکست خوردہ ملک امریکہ ہے۔میرے نزدیک اس کے سب سے زیادہ ذمہ دار امریکی صدر بُش جونیئر ہیں۔امریکہ کے دانشور طبقے کو خود موجودہ امریکی حکومت کے طرزِ عمل کا جائزہ لینا چاہئے اور ''تاریخ کی موت'' کا اعلان کرنے کے بجائے اب تک کی غلطیوں کی تلافی کے لئے ایسے اقدامات کرنے چاہئیں کہ آنے والے وقت میں لکھی جانے والی اِس زمانے کی تاریخ میں امریکی حکام کا کردار امریکی قوم کے لئے بھی بہت زیادہ شرمندہ کرنے والا نہ ہو۔

☆☆☆

# تاریخی تسلسل پر ایک سرسری نظر

میں نے اپنے سابقہ ایک دو کالموں میں بعض مغربی دانشوروں کی جانب سے ''تاریخ کے خاتمے'' کے اعلان کا ذکر کیا ہے۔ آج اسی حوالے سے کچھ ان کی سنانے اور کچھ اپنی کہنے کی کوشش کروں گا۔ یوں تو آج سے تقریباً تین سو سال پہلے ہیگل جیسے مدبر اور فلسفی نے بھی نپولین بونا پارٹ کی جیت پر ''تاریخ کے ختم ہوجانے'' کی بات کی تھی۔ لیکن اس کا کھلا اور واضح اظہار پہلی بار ۱۹۹۱ء میں فرانسس فوکو یاما نے اپنی کتاب The End of History and the Last Man میں کیا۔ یہ وہی سال ہے جب سینیئر بُش کے دورِ حکمرانی میں امریکہ نے عراق پر حملہ کیا تھا۔

آخر مغربی دانشوروں کو تاریخ کے خاتمے سے اتنی دلچسپی کیوں ہے؟ کسی فلسفیانہ موشگافی میں گئے بغیر اس کے مختلف پہلوؤں پر آسان انداز میں غور کر کے دیکھتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تاریخ نے ہمیشہ سچ نہیں لکھا۔ تاریخ ہمیشہ یکطرفہ نہیں ہوتی۔ تنخواہ دار تاریخ دانوں نے تو اپنا حقِ نمک ادا کرنا ہوتا ہے، بظاہر غیر جانبدار مورخین بھی اپنی ترجیحات سے ہٹ نہیں سکے۔ مختلف اقوام یا گروہوں کے نزدیک کسی ایک ہی وقوعہ کو بیان کرنے اور اس سے نتائج اخذ کرنے کا انداز مختلف ہوجاتا ہے۔ زیادہ دور نہیں جاتے برِصغیر کے مغلیہ دور کے دو حکمرانوں کے بارے میں



تاریخ کے کردار کو دیکھ لیں۔ جہانگیر کا عدل مشہور تھا۔ جب اس کی ملکہ نے ایک عورت کے شوہر کو شوقِ تیر اندازی میں قتل کر دیا اور وہ عورت فریاد لے کر مغل انصاف کے دروازے پر پہنچی تو ''عدلِ جہانگیری'' نے تاریخ ساز فیصلہ سنایا کہ جیسے ملکہ نے تمہیں بیوہ کیا ہے ویسے ہی تم ملکہ کو بیوہ کر دو (ارے بھائی سزا دینا ہے تو اپنی ملکہ کو سزا دو۔ یہ کیا ڈھونگ ہے)۔۔۔۔مظلوم فریادی عورت بادشاہ کے انصاف سے خوش ہوئی اور بادشاہ سلامت کو سلامتی اور درازئ عمر کی دعا دیتی ہوئی رخصت ہوئی۔ اب کون کہہ سکتا ہے کہ وہ فریادی عورت بادشاہ کے فیصلے کے مطابق بادشاہ کو قتل کرنا چاہتی تو واقعی مغل بادشاہ کو قتل کرنے کی نوبت آنے دی جاتی!

دوسرا واقعہ اورنگ زیب کے کردار کا ہے۔ ان کے مخالفین نے لکھا ہے کہ اس نے اپنے ہر بھائی کو سیاسی دھوکہ دہی سے مارا۔ اپنے باپ کو عمر بھر قید میں رکھا۔ برصغیر میں مذہبی منافرت کا بیج بویا جس کی فصل آج تک مسلمان کاٹ رہے ہیں۔ ان کے حمایتیوں نے اورنگزیب کو ایک خدا ترس، دین اسلام کی پابندی کرنے والا اور خوف خدا رکھنے والا بادشاہ قرار دیا۔ دونوں تاریخوں کے بیچ ابنِ انشا کی یہ بات توازن پیدا کر دیتی ہے کہ اورنگزیب پکا مسلمان تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں نہ کبھی کوئی نماز چھوڑی اور نہ اپنے کسی بھائی کو چھوڑا۔

اس سے ظاہر یہ ہوا کہ کسی تاریخ میں بے شک مبالغہ آرائی، جانبداری، اپنی ترجیحات اور تعصّبات راہ پا جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود اس کے متوازی ایک دوسری تاریخ بھی لکھی جارہی ہوتی ہے اور آنے والا وقت خود ہی دونوں کے اضافی بیانات کو ہٹا کر اصل حقائق تک یا ان کے قریب تک پہنچ جاتا ہے۔

مسترد کر کے جھوٹی تاریخیں
وقت خود جھوٹ، سچ نتارتا ہے

حقیقت یہ ہے کہ (بقول ڈبلیو۔ایچ۔آڈن) انسان خود تاریخ ساز مخلوق ہے۔ اگر حال میں ماضی موجود ہے تو تاریخ سے نجات ممکن نہیں ہے۔ اور ''تاریخ کے خاتمے'' کے اعلان کا نتیجہ بھی مغربی دانشوروں کے ان اعلانات سے مختلف نہیں ہوگا جو وہ ''خدا کی موت''، ''انسان کی موت''، ''ادب اور ادیب کی موت''، ''آرٹ کا خاتمہ''، ''نظریے کا خاتمہ'' جیسے اعلانات کی صورت میں کر چکے ہیں۔ بلکہ عین اس وقت جب تاریخ کے خاتمے کا اعلان کیا جارہا ہے

اور ''تاریخ پڑھانا بند کرو'' جیسے سبق دہرائے جا رہے ہیں، تاریخ ایک نئے روپ میں اپنے آپ کو لکھ رہی ہے۔۔۔۔وقت گزرنے کے بعد پتہ چلے گا کہ تاریخ کے خاتمے کا اعلان کرنے والوں کا اپنا خاتمہ ہو گیا۔

اگر ہم تاریخ کی (جزوی جانبداری کے باوجود) صداقت کے قائل ہیں تو پھر آیئے آج تاریخ کا ایک خاص تسلسل میں ایک مختصر سا سفر کرتے ہیں۔ یہ ایک واقعہ تب کا ہے جب مسلمان کفارِ مکہ کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر مدینہ ہجرت کر چکے تھے اور وہاں اسلام پھلنے پھولنے لگا تھا۔ کفارِ مکہ کا ایک قافلہ تجارت کے بعد مکہ واپس جا رہا تھا۔ رستے میں ان کی بعض مسلمانوں سے ''ہائے ہیلو'' ہو گئی۔ مکہ کے تاجروں نے فوراً مکہ پیغام بھیجا کہ ہمارے قافلے کو مسلمان لوٹ رہے ہیں۔ کفارِ مکہ طاقت کے نشے میں اٹھے اور مدینہ پر حملہ کے لئے چل پڑے۔ رستے میں قافلے والے مل گئے۔ پتہ چلا خبر درست نہ تھی۔ مسلمانوں نے قافلہ لوٹا نہیں تھا۔ اور یہ کہ اب سب خیریت ہے۔ لیکن طاقتور کفارِ مکہ پھر بھی مدینہ پر چڑھ دوڑے۔ نتیجہ جنگ بدر کی صورت میں سامنے آیا۔

دوسرا واقعہ تب کا ہے جب دیبل (کراچی) کی بندرگاہ پر مسلمان بحری مسافروں کو روک لیا جاتا ہے۔ مسلم حکمرانوں کو ایک بیوہ کی فریاد پہنچتی ہے اور وہاں سے محمد بن قاسم کی قیادت میں فوج روانہ ہوتی ہے۔ رستے میں عربی فوج کو بتایا جاتا ہے کہ راجہ داہر نے سارا لوٹا ہوا سامان واپس کر دیا ہے اور ہم سب خیریت سے ہیں۔ لیکن اب اسلامی عرب فوج کے پاس طاقت ہے۔ راجہ داہر دیبل سے ملتان تک بھاگتا ہے۔ ملتان تک اس کا پیچھا کیا جاتا ہے اور آخر اسے ہلاک کر کے ''ظلم'' کا بدلہ لے لیا جاتا ہے۔

ان دونوں واقعات کو ذہن میں رکھیں اور پھر آج کے عہد میں آئیں۔ جدید سائنسی ترقیات، اسی سائنس کی بنیاد پر ہلاکت خیز اسلحہ کے انبار اور اس میدان میں مغرب کی بالا دستی۔۔۔ بہرحال ایک حقیقت ہیں۔ اسی حوالے سے امریکہ کا عراق پر حملہ ہو یا افغانستان پر حملہ ہو یہ سب بہانے ہیں ایسے بہانے ہر طاقتور آسانی سے گھڑ لیتا ہے اور ان کے مقابلہ میں کمزور کی مظلومیت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ وقت کے رواں لمحوں میں ظالم اور طاقتور ہی سچا ہوتا ہے لیکن وقت گزرنے کے بعد تاریخ سچ اور جھوٹ کے دونوں رُخ سامنے لے آتی ہے۔



مجھے یقین ہے آنے والے وقت میں امریکی صدر جارج بُش اپنی کمزور شخصیت کے باوجود مغربی فکر (نیطشے) کے ''سُپر مین'' کی علامت کے طور پر اور اسامہ بن لادن شخصی سطح پر اتنے اہم نہ ہونے کے باوجود اقبال کے ''مردِ مومن'' کی علامت کے طور پر یاد کئے جائیں گے۔ ان دونوں فلسفوں میں جو مطابقت اور جو تفریق ہے وہ مزید کھل کر سامنے آئے گی کیونکہ اب معاملہ فلسفے سے آگے ''عمل'' کے دائرے میں آ چکا ہے اور اس سارے عمل کی تاریخ لکھی جا رہی ہے۔

''تاریخ کی موت'' کے اعلان کے باوجود تاریخ لکھی جا رہی ہے کیونکہ تاریخ زندہ ہے!

☆☆☆

# تاریخ سے فرار کیوں؟

آج کا انسانی عہد اس لحاظ سے انسانی ترقی کا حیرت انگیز دور ہے کہ انسان کی معلوم تاریخ کی حد تک بلکہ ماقبل تاریخ کے آثار تک، ایسی ترقیات کا عشرِ عشیر بھی کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ پوری دنیا جیسے ایک عالمی گاؤں میں تبدیل ہوتی محسوس ہوتی ہے۔ وہ سہولتیں اور آسائشیں جو پہلے زمانے میں صرف بادشاہوں یا راجوں، مہاراجوں تک محدود تھیں، اب عام انسان تک بلا تفریق پہنچ رہی ہیں۔ بلکہ ایسی سہولیات جن کا پہلے زمانے کے حکمرانوں نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا آج کے عام انسان کو باآسانی میسر ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک میں تو ایسی سہولیات اب ضروریاتِ زندگی میں شمار ہوتی ہیں۔ ترقی پذیر اور پسماندہ ممالک میں ایسی تمام سہولیات کو پہنچانا اور سب کو ان سے فیضیاب کرنا دراصل اس عالمی وحدت کی طرف پیش قدمی ہوگا جس میں دنیا کے تمام انسان اپنے اپنے جغرافیائی، ثقافتی، مذہبی اور لسانی تشخص کو برقرار رکھتے ہوئے پورے کرۂ ارض کو ایک ملک مان کر اس کے باشندے کہلا سکیں گے۔ انسانیت اسی طرف گامزن تھی لیکن سوویت یونین روس کی ٹوٹ پھوٹ کے بعد عالمی سطح پر جو انسانیت سوز کاروائیاں ہوتی چلی جا رہی ہیں ان کے پیش نظر خود اس کرۂ ارض پر انسانیت کی بقا کو شدید خطرات لاحق ہو گئے ہیں۔ ان تمام خطرات کی بیشتر ذمہ داری امریکی حکمرانوں پر عائد ہو رہی ہے۔

اس وقت عالمی سطح پر وحشیانہ حد تک انسانیت کے خلاف جو کاروائیاں ہو رہی ہیں ان میں براہِ راست اسرائیلی انتہا پسند یہود اور ہندوستان کے انتہا پسند ہنود ملوث ہیں اور ان ہر دو کی سرپرستی



امریکہ سرکار کر رہی ہے۔ یوں اسرائیل، ہندوستان اور امریکہ نے مل کر اپنی مزعومہ ''دہشت گردی'' کے خلاف طلائی تثلیث بنالی ہے۔ اسرائیل اور ہندوستان اپنی کاروائیوں کو کس بنیاد پر حق بجانب سمجھتے ہیں؟ اور امریکہ کس بنیاد پر ان کی بالواسطہ یا بلاواسطہ حمایت کر رہا ہے؟ اس کی کنہ تک پہنچنے کے لئے اسرائیل اور ہندوستان کے انتہا پسندوں کے موقف کو ان کے اندازِ نظر کے مطابق جان لینا ضروری ہے۔

پہلے اسرائیلی موقف۔۔۔۔ یہودی، امتِ کلیم ہیں۔ بنی اسرائیل خدا کی بے حد پیاری قوم رہی ہے۔ اس کی غلطیوں اور گناہوں کے نتیجہ میں خدا نے ان پر ایک ظالم قوم کو مسلط کر دیا۔ مسلمانوں نے انہیں مدینہ سے نکالا۔ خیبر تک یہودیوں کو دھکیلا گیا اور پھر وہاں سے بھی نکال دیا گیا۔ یہودیوں کا اصل مرکز یروشلم ان سے چھن گیا۔ سارے ظالموں نے مل کر بنی اسرائیل کو گھر سے بے گھر کر دیا، ساری دنیا میں تتر بتر کر دیا۔ ان کا نام ایک گالی بنا دیا گیا۔۔۔۔ اب خدا نے بنی اسرائیل پر پھر اپنی رحمت کی نظر کی ہے اور ساری دنیا سے سمیٹ کر اب پھر انہیں اسرائیل میں یکجا کر دیا ہے۔ اب سلطنت اسرائیل قائم ہو گئی ہے اور مزید خدائی وعدے بھی پورے ہوں گے۔ ہیکل سلیمانی ہو یا دوسرے اسرائیلی مقدس مقامات۔۔۔۔ وہ سب سے پہلے ہمارے مقدس مقامات ہیں اور ان کی تعمیر اور حفاظت ہمارا فرض ہے۔ مدینہ سے ہمیں محض طاقت کے بل بوتے پر نکالا گیا تھا اور مدینہ بدری سے لے کر خیبر سے نکالنے تک ہم پر ''طاقت کا فارمولا'' لاگو کیا گیا۔ سو اب ہم بھی ''عظیم اسرائیل'' قائم کر کے رہیں گے۔ اس گریٹر اسرائیل میں مدینہ شہر تو شامل ہوگا کہ ہم وہاں رہتے تھے لیکن ہم مکہ پر بھی قبضہ کریں گے تاکہ مدینہ سے نکالے جانے کی تلافی کر سکیں۔ ہم مدینہ کے بھی اصل باسی تھے اور مکہ والوں نے ہمیں وہاں سے نکال دیا اور ہم اسرائیل کے بھی اصل باشندے ہیں جنہیں صدیوں تک ظلم کر کے اپنے گھر سے بے گھر کیا گیا۔۔۔۔ اس اسرائیلی موقف کے خلاصہ کے ساتھ یہاں یہ واضح کر دوں کہ آج سے لگ بھگ پچاس سال پہلے گریٹر اسرائیل کا جو نقشہ بنایا گیا تھا اس میں مکہ اور مدینہ دونوں کو اسرائیل میں شامل دکھایا گیا تھا۔

اور اب انتہا پسند ہندوؤں کا موقف۔۔۔۔ مسلمان بیرونی حملہ آور تھے۔ انہوں نے ہماری دھرتی پر طاقت کے ساتھ قبضہ کیا۔ ہم پر جبراً حکمرانی کی۔ اس عرصہ حکمرانی میں ہمارے

ساتھ ہر سطح پر ظلم کیا گیا۔ جب انگریزوں کے جانے کے بعد ہندوستان کو آزادی ملنے لگی تو تب مسلمانوں نے اس دھرتی کے عوام کے جمہوری مزاج کا ساتھ دینے کے بجائے اپنے لئے الگ وطن بنوالیا۔ اگر یہ اقلیت میں ہو کر انصاف پسند حکمران تھے تو اب انہیں اکثریت سے کیا خوف تھا؟ ہم پر ماضی میں بہت ظلم ہوا ہے۔ ہم اسے نہیں بھول سکتے۔

ہندوؤں اور یہودیوں کے یہ موقف تاریخ کے تلخ ابواب ہیں۔ان پر۔۔۔محض یکطرفہ موقف کی بنیاد پر فیصلہ صادر نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرے فریق کے موقف کو ساتھ رکھا جائے تو پھر کسی ایک فریق کی نہیں بلکہ تمام متعلقہ فریقین کی اچھائیاں اور زیادتیاں، دونوں ہی واضح ہو جاتی ہیں۔ لیکن فی الوقت یہ میرا موضوع نہیں ہے۔ تاہم یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ مسلمانوں سے پہلے آریا لوگ ہندوستان پر حملہ آور ہوئے تھے۔ مسلمان حکمرانوں کی کوئی غلطیاں واقعتاً قابلِ گرفت ٹھہرتی بھی ہیں تو آریاؤں نے ہندوستان کے اصل باشندوں پر جو ظلم ڈھائے تھے ان کے مقابلہ میں مسلمانوں کی غلطیاں تو محض سہو ہی شمار کی جا سکتی ہیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ موجودہ انتہا پسند ہندو درحقیقت آریائی بیلٹ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور وہ خود بھارت پر بیرونی حملہ آور ہی تھے۔ لہٰذا ایک بیرونی حملہ آور دوسرے کو حملہ آور قرار دے کر خود کیسے گھر کا مالک بن سکتا ہے؟ جنوبی ہندوستان کی بڑی آبادی اس خطہ کے اصل باشندوں کی باقیات ہے اور آج بھی دہلی کے سامنے ان جنوبی صوبوں کے مرکز گریز رجحانات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہاں کے اصل باشندے لاشعوری طور پر آج بھی آریائی حملہ آوروں کو ناپسند کرتے ہیں۔

اسرائیل کا معاملہ یوں ہے کہ یہ محض عقائد کا جھگڑا نہیں ہے۔ بلکہ دیکھا جائے تو فکری لحاظ سے آج دنیا میں ایک دوسرے سے سب سے زیادہ قریب دو ہی دین ہیں۔ یہودیت اور اسلام۔۔۔وجہ یہ ہے کہ دونوں کی بنیاد معتقدات اور تعلیمات دونوں حوالوں سے ابراہیمی دین پر استوار ہے ۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ معتقدات کی حیثیت ثانوی ہے اصل جھگڑا کچھ اور ہے۔۔۔اسرائیل کتنی دفعہ تاراج ہوا، یروشلم کتنی دفعہ اجڑا، کیا ہر بار مسلمان اس کے ذمہ دار تھے؟ کیا مسیحی چرچ نے یہودیوں کو تھوڑا مارا تھا؟

تاریخ کے تسلسل میں دیکھا جائے تو قوموں میں عروج و زوال کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔نقل مکانی کا سلسلہ بھی ایک عرصہ سے جاری ہے اور جاری رہے گا۔اس میں مختلف اوقات میں مختلف



جبر شامل ہوتے رہے ہیں۔ کبھی بڑھتی ہوئی آبادی کا جبر، کبھی موسموں کا جبر، کبھی سیاسی جبر اور کبھی کوئی اور جبر۔۔۔لیکن اس کی بنیاد پر دنیا کے کسی بھی خطے میں اگر صدیوں بعد کوئی آئے اور آ کر وہاں صدیوں سے آباد لوگوں سے کہے کہ تم یہاں سے نکلو ہم یہاں کے اصلی باشندے تھے اور اب ہم آ گئے ہیں۔ تم لوگوں کے آباؤ اجداد نے ہم پر بڑے ظلم توڑے تھے اب ہم تمہیں نہیں چھوڑیں گے، تو آج کے مہذب اور ترقی یافتہ دور میں کوئی بھی اسے معقول بات نہیں مانے گا۔ ایسے لمحات میں جب انسانی گلوبل ولیج کی باتیں قابلِ عمل دکھائی دے رہی ہیں ایسی علاقائیت پرستی، نسلی برتری کی جہالت، اور تاریخ کو مسخ کرتے ہوئے ''ماضی کے مبینہ دشمنوں'' کا بدلہ آج کے بے قصور لوگوں سے لینا، انسانیت کو تباہی کی طرف دھکیلنے کے مترادف ہے۔ افسوسناک امر یہ ہے کہ تاریخ کے ساتھ کھلواڑ کرنے والے انتہا پسند اسرائیلی یہودی اور انتہا پسند ہندوستانی ہندو دونوں کو امریکہ سرکار کی مکمل سرپرستی اور تائید حاصل ہے۔

اب اسی حوالے سے امریکہ سرکار سے کہا جائے کہ ٹھیک ہے صاحب! واقعی ہندوستان میں مسلمان ہی حملہ آور تھے اور یہودیوں کو بھی صرف مسلمانوں نے ہی بے گھر کیا تھا لہٰذا اب ہندوستان اور اسرائیل کو مسلمان حملہ آوروں سے پاک کر دیا جائے۔ لیکن سرکار اسی اصول کی بنیاد پر ایک اور فیصلہ بھی لگے ہاتھوں کرتے جائیے۔۔۔امریکہ کے اصل باشندے بھی ریڈ انڈینز تھے۔ ان مظلوموں پر آپ حضور کے آباؤ اجداد نے جو ظلم توڑے تھے وہ خود آپ لوگوں کی اپنی کتابوں میں بھی مذکور ہیں۔ بس ہندوستان کے انتہا پسند ہندوؤں اور اسرائیل کے انتہا پسند یہودیوں کی ''حق رسی'' کے ساتھ ان غریب ریڈ انڈینز کی بھی حق رسی کر دیجئے۔ یہاں کے اصل باشندوں ریڈ انڈینز کو بھی امریکہ سونپ دیجئے۔ ماضی میں یورپ کے جتنے جرائم پیشہ لوگوں نے یورپ سے فرار ہو کر اس خطے کے اصل باشندوں، ریڈ انڈینز کو مار کر اس خطہ کو اپنی پناہ گاہ بنایا اور پھر یورپ کے ہر مجرم کے لئے اسے جنت بنا دیا، آپ اب اپنے ان جرائم پیشہ اور مفرور آباؤ اجداد کی زیادتیوں اور مظالم کی تلافی کرتے ہوئے ان ریڈ انڈینز کو بھی ان کا حق عطا کر دیجئے۔ کیا امریکہ سرکار انتہا پسند یہودیوں اور انتہا پسند ہندوؤں کے اس خود ساختہ ''اصول'' پر خود امریکہ میں بھی اس اصول کو لاگو کرنے کے لئے تیار ہے؟

خیال رہے کہ ہندوستان اور اسرائیل کے ساتھ مسلمانوں کا رویہ لگ بھگ ہزار، ڈیڑھ ہزار

سال پہلے کی بات ہے جبکہ موجودہ امریکیوں کا امریکہ کے اصل باشندوں ریڈ انڈینز کے ساتھ سلوک ابھی چند صدیاں پہلے کا قصہ ہے۔

امریکہ کے دانشوروں کو اپنی تمام تر روشن خیالی کے باوجود ''تاریخ کے خاتمے'' سے اتنی دلچسپی کیوں ہے؟ وہ تاریخ سے کیوں فرار اختیار کرنا چاہتے ہیں؟ پرانے یورپ کے مفرور، جرائم پیشہ لوگوں اور ریڈ انڈینز کے ذکر سے ذہین قارئین اس کے نفسیاتی پس منظر کو بخوبی سمجھ گئے ہوں گے۔

☆☆☆



# اتنا ظلم مت کیجئے

ہماری دنیا کا موجودہ غیر متوازن، غیر منصفانہ اور غیر انسانی نقشہ ویسے تو آڑی ترچھی لکیروں کے ساتھ ایک عرصہ سے بن رہا تھا۔ سوویت یونین کے خلاف پاکستان اور عرب ممالک کے ذریعے امریکہ سرکار کی طرف سے باقاعدہ ''اسلامی جہاد'' کا اعلان کرایا جانا اوران مجاہدین کو امریکی اور دوسرے مغربی میڈیا پر بڑے پیمانے پر پیش کیا جانا اورخراجِ تحسین پیش کرنے کے ساتھ انہیں ہرطرح کی فوجی اور مالی امداد بھی فراہم کی جانی۔ پھر سینئیر بُش کے زمانے میں عراق پر وحشیانہ حملہ۔۔۔اور اس حملہ کے بعد سے اب تک عراق کے خلاف مختلف انسانیت سوز پابندیاں۔۔۔ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر طیاروں کے حملہ کے ڈرامہ سے پہلے ہی ہندوستان کی بی جے پی سرکار کی اسرائیلی سرکار سے محبت کی پینگیں اور کشمیر میں کشمیریوں کی جدوجہد آزادی کو دبانے کے لئے اسرائیلی بربریت کے طور طریقے جاننے کی کھلی خبریں۔۔۔پھر سپین سے مسلمانوں کے مکمل صفایا کی تاریخ کو زیادہ توجہ سے دیکھنے کا عمل۔۔۔یہ سب کچھ ایک ساتھ ہو رہا تھا اور ایسے لگ رہا تھا کہ انتہا پسند یہودی اور انتہا پسند ہندو لابیوں کو کسی طویل منصوبہ بندی کے تحت مربوط کیا جا رہا ہے۔ یہ سب کچھ امریکی سرکار کی ''جنبشِ ابرو'' سے ہو رہا تھا۔ تاہم ابھی یہ سب ہلکی لکیریں سی ابھر رہی تھیں۔

ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر ہوائی جہازوں کے حملہ کے ڈرامہ کے بعد یہ ہلکی لکیریں ایک واضح پنسل اسکیچ کی طرح سامنے آ گئی ہیں اور ابھی اس کے مزید خدوخال نمایاں ہو رہے ہیں۔ گزشتہ نصف

صدی کی بے رحمانہ یہودیانہ سرگرمیوں کے ساتھ اسرائیل اپنے کئے ہوئے تمام تر معاہدوں کی دھجیاں بکھیرتے ہوئے فلسطینیوں پر جو قیامت ڈھا گیا ہے ہندوستان میں بی جے پی سرکار نے بالکل انہیں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے نہ صرف کشمیریوں کے خلاف وحشیانہ کاروائیاں تیز کر دیں بلکہ گودھرا ریلوے اسٹیشن کے سانحہ کو بہانہ بنا کر گجرات میں تجرباتی طور پر مسلمانوں کا انتہائی سفاکانہ قتل عام شروع کرادیا۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو پاکستان اور انڈیا کے درمیان دوستانہ تعلقات کے لئے ہمیشہ دعا گو رہتے ہیں۔ اور خلوص دل سے دونوں ملکوں میں محبت کا رشتہ قائم ہوتا دیکھنا چاہتے ہیں۔ بلکہ میں تو یورپی یونین کی طرز پر سارک ممالک میں اتحاد کا خواب بھی دیکھتا ہوں۔ میں بہت سارے نیک طینت اور بہت ہی محبت کرنے والے ہندوؤں کو نہ صرف جانتا ہوں بلکہ بہت سوں سے میرے محبت کے تعلق بھی ہیں، اسی لئے میں سفاک لوگوں کے لئے ہندوؤں کے بجائے ''انتہا پسند ہندوؤں'' کے الفاظ استعمال کر رہا ہوں۔۔۔۔ مجھے نہایت دکھ سے یہ اقرار کرنا پڑ رہا ہے کہ مجھ جیسے پاکستانیوں اور میرے جیسے جذبات رکھنے والے ہندوستانیوں کی تمام تر نیک خواہشات کے باوجود اب مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان ایسی خلیج بڑھتی جا رہی ہے جسے پاٹنے کے لئے پتہ نہیں کتنا وقت لگے گا۔ اور پھر بھی پتہ نہیں خلیج کم ہوگی یا مزید بڑھتی ہی چلی جائے گی۔

یہ سارا منظر ایک واضح نقشہ کی صورت میں سامنے آتا جا رہا ہے۔

اگرچہ ابھی تک امریکہ اور انڈیا بظاہر اپنے کسی مذہبی تعصب سے انکار کرتے ہیں۔ لیکن دیکھا جائے تو امریکہ، انڈیا اور اسرائیل کا نشانہ براہ راست مسلمان ہی ہیں۔ بے شک اس وقت امریکہ، اسرائیل اور انڈیا کے انتہا پسند نسلی برتری کے اسی زعم میں مبتلا ہو گئے ہیں جس میں کبھی جرمنی کا ہٹلر مبتلا ہوا تھا۔ ہٹلر کے زعم کی وجوہات اور تھیں۔ اس کا ٹکراؤ خود یہودی نسل پرستوں سے تھا۔ اس لئے یہ ایک جیسے ذہن رکھنے والے دو مختلف نسل پرستوں کا ٹکراؤ تھا۔ اُس کے برعکس اِس وقت مسلمانوں کے خلاف یہودیوں، مسیحیوں اور ہندوؤں کی انتہا پسند قوتیں اپنی ماضی کی نفسیاتی وجوہات کے باعث سرگرم عمل ہیں۔ ان تمام نفسیاتی گرہوں میں ''شدید احساسِ کمتری'' ایک اہم فیکٹر ہے جو مسلمان حکمرانوں کی صدیوں کی حکمرانیوں کے باعث ان قوموں میں سرایت کر گیا تھا اور جو اِس مہذب دور میں بھی، اِن پڑھے لکھے، شائستہ، معتدل اور وسیع القلب امریکی اور انڈین



حکمرانوں کے ذہنوں اور دلوں سے نہیں نکل سکا۔ بی جے پی کے ہندوستانی وزیر اعظم واجپائی نے جب سرِ عام یہ کہا کہ مسلمان بادشاہوں نے بہت ظلم کئے تھے اور پھر غصے میں یہ کہتے ہیں کہ اسلام کے دو چہرے ہیں تو دراصل یہ ان کا وہی نفسیاتی احساسِ کمتری بول رہا تھا جس سے وہ نسلوں بعد بھی چھٹکارا حاصل نہیں کر سکے۔ اور جب امریکی صدر جونیئر بش طالبان اور القاعدہ کا بہانہ بنا کر افغانستان کے بے سروسامان افغان عوام پر وحشیانہ بمباری شروع کراتے ہوئے بے ساختگی سے کہتے ہیں کہ اب صلیبی جنگ شروع ہوگئی ہے تو اس بیان میں بھی لاشعوری طور پر سہی ان کا وہی نفسیاتی احساسِ کمتری اپنی پوری شدت کے ساتھ کارفرما تھا۔

میں اس نفسیاتی وجہ کو اس لئے بیان نہیں کر رہا کہ اس سے کسی مذہب سے متعلق لوگوں کی تحقیر کی جائے، بلکہ اس لئے بیان کر رہا ہوں کہ اس وقت مسلمانوں پر جو قیامتیں ڈھائی جا رہی ہیں ان کی وجہ اپنے اصل پس منظر کے ساتھ سامنے آ سکے۔

اس وقت مہذب دنیا بالخصوص امریکہ اور یورپ کی اخلاقی ذمہ داری بنتی ہے کہ مسلمانوں کے پُرکھوں کی اپنے پُرکھوں سے کی گئی مبینہ کردہ اور ناکردہ زیادتیوں کی سزا ان مسلمان لوگوں کو مت دیں جو آج کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ نسل پرستی اور برتری کے منفی رویوں سے چھٹکارا پائیں اور اپنی سائنسی ترقیات اور انسانیت کو فیض پہنچانے والی ایجادات سے بلا امتیاز پوری انسانیت کو فیضیاب کریں۔ گلوبل ویلج کا منظر ہی آج کی اور آنے والے زمانے کی حقیقت ہو، تاکہ اس دھرتی کو بلا امتیاز سارے انسانوں کے لئے امن، سکون، خوشحالی اور محبت کا گہوارا بنایا جا سکے۔ اس وقت ویسے تو بلاشبہ مسلمانوں میں بھی بہت سے اصلاح طلب امور ہیں۔ فرقہ واریت، دوسرے مسلک اور مذہب کے لوگوں کے معاملات میں عدم برداشت، جدید زمانے کی رفتار کا ساتھ نہ دے پانے کے مسائل، علاقائی تعصّبات، اسلام سے نام کی حد تک وابستگی اور ذاتی مفاد پرستی ایسے امور ہیں جن سے خود مسلمانوں نے اپنے آپ کو زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔ اور عالمی سطح پر مسلمانوں کی موجودہ ذلت آمیز حیثیت کے اسباب میں یہ سارے امور شامل ہیں اور تا حال ان خرابیوں کے دور ہونے کی کوئی صورت بھی دکھائی نہیں دے رہی۔ تاہم ان خرابیوں کے باعث امریکہ، اسرائیل اور انڈیا کے انتہا پسندوں کو مسلمانوں کی نسل کشی کا لائسنس دے دیا جانا انتہائی شرمناک رویہ ہے۔

اس وقت دنیا کے باقی مذاہب کے لوگوں کے لئے اور خاص طور پر امریکہ اور انڈیا کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے نفسیاتی اثرات کے خول سے باہر نکلیں اور دنیا میں عالمِ اسلام کے سلسلے میں موجودہ عدم توازن کو خود دور کریں۔ گجرات کے سانحہ پر مغربی حکومتوں اور پریس کا ردِعمل غیر موثر ہے۔ ایسا سانحہ جو گزشتہ ایک صدی کا سب سے ہولناک سانحہ ہے اور جسے اڑھائی ماہ گزرنے کے بعد بھی بی جے پی کی حکومت نے جان بوجھ کر ختم نہیں ہونے دیا۔۔ اس پر مغربی میڈیا نے جتنا ردِ عمل ظاہر کیا ہے اس سے صرف مغربی میڈیا کا منافقانہ کردار مزید واضح ہوتا ہے۔ اس ''ردِعمل'' کو پنجابی میں ''گونگلواں توں مٹی جھاڑنا'' (شلجم سے مٹی جھاڑنے) کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس سے زیادہ موثر تو خود انڈیا کے مہذب پریس کا ردِعمل رہا ہے۔ صاف ظاہر ہے یہ ظلم، اور اس پر مسلم دشمنی پر تلی ہوئی ''مہذب'' دنیا کا ردِعمل بھی ان کے صدیوں کے نفسیاتی اثرات کا نتیجہ ہے۔ دنیا میں امن، سکون اور محبت کے فروغ کے لئے زبانی کلامی نہیں بلکہ عملاً عدم توازن کو ختم کرنا ہوگا سب کے لئے یکساں انصاف کرنا ہوگا۔ دہشت گردی کی آڑ میں مسلمانوں کی نسل کشی پر تلی ہوئی ساری ''مہذب'' دنیا سے مودبانہ گزارش ہے کہ ذہنی طور پر سابقہ زمانوں کے حساب کے پھیر سے نکلیں اور کھلے دل کے ساتھ دنیا کی قیادت کریں۔

سابقہ زمانوں کے حساب کتاب میں پڑیں گے تو پھر سب کے ذمہ ''بہت کچھ واجب الادا'' نکلے گا۔

اور آج کا زمانہ بھی تو ایک دن سابقہ زمانوں ہی میں شمار ہوگا۔

☆☆☆



# ٹریڈ سنٹر پر اصل حملہ آور کون؟

۱۱ رستمبر ۲۰۰۱ء سے پہلے تک دنیا میں عدم توازن کی جو لکیریں سی بن رہی تھیں، ۱۱ رستمبر کے بعد اس کا نقشہ کھل کر سامنے آ گیا۔ امریکہ کے ٹریڈ سنٹر کی دونوں عمارتوں کی تباہی کے بعد امریکہ کا غم و غصہ انتہا تک جا پہنچا۔ پھر دہشت گردی کے خلاف ایسی جدوجہد شروع ہوگئی جس میں کسی ثبوت کی ضرورت نہ تھی۔ جب دہشت گردی کی کوئی معین تعریف ہی وضع نہ کی جا سکی تو پھر یہ فیصلہ کون کرے گا کہ کوئی تحریک ''آزادی'' کی تحریک ہے یا دہشت گردی کی تحریک؟ گویا اب کسی اصول اور ضابطے کی گنجائش نہ تھی۔ اقوام متحدہ جو پہلے امریکہ کی باندی تھی اب داشتہ دکھائی دینے لگی لیکن امریکہ نے اقوام متحدہ کو داشتہ جتنی اہمیت بھی نہیں دی اور خود ہی جو کچھ کر سکتا تھا، کر گزرا۔ گو امریکہ نے دکھاوے کے طور پر متعدد ہمنوا ساتھ شامل رکھے تاہم اصلاً یہ سارے کا سارا امریکی ردِعمل تھا اور ابھی تک یہ امریکی ردعمل چل رہا ہے۔

اصل حقائق کی نشاندہی سے پہلے یہ وضاحت کر دوں کہ مجھے ذاتی طور پر، فکری طور پر طالبان یا القاعدہ قسم کے گروہوں سے کبھی کسی قسم کی انسیت نہیں ہوئی۔ بلکہ میرے فکری دھاروں کو جاننے کے بعد وہ یقینی طور پر میرے واجب القتل ہونے کا فتویٰ دے سکتے ہیں۔ اس کے باوجود جہاں تک حق اور انصاف کا تعلق ہے اگر اس کا اظہار کرنے سے محض اس لئے گریز کیا جائے کہ

متعلقہ فرد یا طبقہ سے میری نہیں بنتی تو یہ کم ظرفی کی انتہا ہوگی۔ بلند بانگ دعوے کرنے والے کم ظرف لوگ اور کم ظرف طبقے ہی اتنا گر سکتے ہیں۔ میں ایک معمولی سا لکھنے والا اور کچھ نہیں تو سامنے کے حقائق کو جیسے دیکھ رہا ہوں اور محسوس کر رہا ہوں ویسا ہی لکھ تو سکتا ہوں۔ برائی کو روک نہیں سکتا، لیکن اسے برائی تو کہہ سکتا ہوں۔

اگر واقعی ٹریڈ سنٹر کی عمارتوں کی تباہی میں طالبان اور القاعدہ کا ہاتھ ہے تو جو کچھ امریکہ نے کیا ہے وہ اس سارے عمل میں بالکل حق بجانب ہے۔ لیکن اگر اس کی دونوں عظیم عمارتوں کی تباہی میں طالبان یا القاعدہ کا کوئی ہاتھ نہیں تھا تو پھر موجودہ امریکی حکمرانوں سے زیادہ بے رحم، انسانیت کا دشمن اور سفاک اور کوئی نہیں ہے۔ اگرچہ ابھی تک حقائق کی شفاف صورت سامنے نہیں آئی لیکن جو کچھ سامنے آیا ہے اگر اس سب کو مربوط کر کے دیکھا جائے تو دو واضح نقشے سامنے آتے ہیں۔ ایک نقشہ امریکہ اور اس کے حواریوں کا ہے اور ایک نقشہ طالبان اور القاعدہ کا ہے۔ پہلے امریکہ کا نقشہ دیکھ لیں۔ اس کے مطابق ٹریڈ سنٹر پر ہونے والا حملہ خود یہودیوں اور بعض امریکیوں کی ملی بھگت سے منظّم طور پر کرایا گیا اور منظّم طور پر ہی اس کا الزام القاعدہ کے سر تھوپ دیا گیا۔ اس الزام کے ثبوت میں یہ حقائق اب تک سامنے آ چکے ہیں اور ان حقائق کو مربوط کر کے دیکھنے سے پس منظر میں موجود منظر سامنے دکھائی دینے لگتا ہے۔

☆امریکی صدر جونیئر بُش کو جب حادثہ کی اطلاع دی گئی وہ بچوں کے ایک سکول میں تھے اور خبر سننے کے بعد بھی کافی وقت تک وہیں رہے۔ ان کو حادثہ کی خبر دیئے جانے کی جو ویڈیو فلم امریکی ٹی وی چینلز دکھا چکے ہیں اس سے ایسے لگتا ہے جیسے ان کے لئے یہ کوئی عام سی خبر ہے (''اچھا حملہ ہو گیا ہے؟'')۔ ''باڈی لینگوئج'' کو سمجھنے والے امریکی ماہرین امریکی صدر کے انداز سے خود بہتر نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں۔

☆۱۱رستمبر کو حادثہ کے وقت کوئی یہودی ٹریڈ سنٹر میں موجود نہ تھا۔ جب اس حقیقت کا انکشاف کیا گیا تو اسے مضحکہ خیز قرار دے کر رد کر دیا گیا لیکن بعد میں یہ بات سچ ثابت ہوئی۔ واقعی حادثہ کے وقت کوئی یہودی ان عمارتوں کے اندر موجود نہ تھا۔

☆امریکی صدر جونیئر بُش نے امریکی کانگریس سے اپنے خطاب کے دوران کہا کہ اس حادثہ میں ۱۳۰ر اسرائیلی یہودی ہلاک ہوئے۔ یہ کوئی عام اخباری بیان نہ تھا اور کسی عام ترجمان کے منہ کی



بات بھی نہ تھی۔ امریکی صدر کا بیان تھا اور امریکی کانگریس کے سامنے دیا گیا تھا۔

☆نیویارک ٹائمز نے اپنی ۲۲رستمبر ۲۰۰۱ء کی اشاعت میں واضح کیا کہ جن ۱۳۰ر اسرائیلی یہودیوں کی ہلاکت کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے ۱۲۹ر افراد اپنے گھروں میں زندہ موجود ہیں۔ صرف ایک اسرائیلی یہودی مرا ہے وہ بھی ٹریڈ سنٹر کے اندر نہ تھا بلکہ تباہی کے منظر کا باہر سے نظارا کرتے ہوئے اس کی لپیٹ میں آیا تھا۔

☆حادثہ کے وقت جب سارے نیویارک میں نفسانفسی کا عالم تھا تباہ ہوتی عمارت کے چاروں اطراف سے کم از کم ایسے چھ افراد کو پکڑا گیا جو تباہی کے منظر کی ویڈیو فلمیں بنا رہے تھے۔ یہ سارے کے سارے افراد یہودی تھے اور کوئی پیشہ ور ویڈیو میکر نہیں تھے۔

☆اس تباہی میں جہاں کولمبیا کے ۱۹۹ر اور فلپائن کے ۴۲۸ر باشندے ہلاک ہوئے۔ متعدد دوسرے ممالک کے باشندے ہلاک ہوئے مگر اسرائیلی اور غیر اسرائیلی یہودی بالکل محفوظ رہے۔ جبکہ اس کے مالکان بھی یہودی تھے، اس میں یہودیوں کی ایک بڑی تعداد ملازم تھی۔

☆ٹریڈ سنٹر کی دونوں عمارتیں تھوڑا عرصہ پہلے یہودیوں نے خریدی تھیں۔ ان کی بھاری بھر کم انشورنس چند ماہ (غالباً دو ماہ) پہلے کرائی گئی۔ یوں عمارتوں کی تباہی سے یہودیوں کو کوئی مالی نقصان نہ ہوا۔ بلکہ فائدہ ہی ہوا۔

☆جائے حادثہ سے سارا ملبہ ہٹانے کا ٹھیکہ بھی یہودیوں کو دیا گیا اور یہ ٹھیکہ اصل عمارت کی لاگت سے بھی زیادہ ہے۔

☆دنیا میں پہلی دفعہ ایسا ہوا کہ ٹریڈ سنٹر سے ٹکرانے والے جہازوں کے بلیک باکس نہیں ملے۔ (شاید غائب کر دئے گئے)۔

☆پینٹا گون کی عمارت سے ٹکرانے والے جہاز کا بلیک باکس ملا تو کہا گیا کہ اس میں کوئی ٹیکنیکی خرابی ہوگئی ہے اس لئے کچھ سنائی نہیں دیتا۔ اللہ اللہ خیر صلاّ۔

☆جہازوں کو جس ماہرانہ طریقے سے ٹکرایا گیا تھا، ایسا سارا کام کسی ہائی جیکر کے ذریعے نہیں بلکہ زمین پر ریموٹ کنٹرول کے ذریعے ہو سکتا ہے اور ایسی صورت میں بلیک باکس کچھ بھی بتانے سے قاصر ہوتا۔ اسی لئے ایسے بلیک باکسز کا نہ ملنا ہی بہتر تھا۔

☆ٹریڈ سنٹر کی عمارتوں سے ٹکرانے کے بعد سے پینٹا گون سے ٹکرانے تک ایک بڑا وقفہ تھا لیکن

تب تک کوئی بچاؤ کرنے والا حفاظتی ادارہ حرکت میں نہیں آیا۔

☆بعد میں یہ ہوّا کھڑا کیا گیا کہ وائٹ ہاؤس کی عمارت کو بھی خطرہ لاحق ہے۔حالانکہ پینٹا گون سے ٹکرانے والا جہاز وائٹ ہاؤس سے گزر کر آیا تھا۔کسی ''امریکہ دشمن'' کا ایسا کوئی پلان ہوتا تو وہیں وائٹ ہاؤس سے نمٹ لیا جاتا۔

☆اس سارے ڈرامے میں یہودیوں کے اتنے واضح کردار کے باوجود بڑے موثر طریقے سے پروپیگنڈہ کیا گیا کہ اس میں مسلمانوں کا ہاتھ ہے چنانچہ ایک پورا دن مغربی میڈیا چند عرب افراد کا ایک ایسا منظر دکھاتا رہا جس میں وہ لوگ جشن جیسی خوشی منا رہے تھے۔یوں یہ باور کرادیا گیا کہ مسلمان ہی امریکہ کی تباہی سے خوش ہو سکتے ہیں۔جب نفرت کا زہر پوری طرح انجیکٹ کر دیا گیا تو آدھی رات کے بعد اتنی وضاحت کی گئی کہ یہ کویت کی پرانی فلم تھی جو عراقی قبضہ ختم ہونے کی خوشی منا رہے تھے۔ہمیں کسی نے غلط خبر دی تھی۔آدھی رات کے بعد صرف ایک بار اتنی وضاحت کرنے کے بعد مغربی میڈیا نے دن میں کسی وضاحت کی ضرورت محسوس نہ کی۔دن میں جو نفرت کا زہر انجیکٹ کیا گیا تھا وہی اپنا اثر دکھاتا رہا اور ابھی تک اثر دکھا رہا ہے۔

☆اسامہ بن لادن اور القاعدہ پر الزام لگایا گیا لیکن کسی قسم کا کوئی ثبوت دنیا کے سامنے پیش نہیں کیا گیا۔بس خود ہی مدعی،خود ہی گواہ اور خود ہی منصف۔امریکہ سارے مراحلِ تصوف سے ایک ہی جست میں گزر گیا۔اور پھر افغان عوام پر قیامتیں گزرنے لگیں۔دنیا کی سب سے بڑی اور واحد سپر پاور کہلانے والا امریکہ دنیا کے کمزور ترین اور مفلوک الحال ملک کو فتح کرنے میں کامیاب ہو گیا۔(لیکن کیا واقعی؟)

اب دوسری طرف طالبان اور القاعدہ کا نقشہ بھی دیکھ لیں اگر یہ درست ہے کہ بھوکا، ننگا افغانستان طالبان اور القاعدہ کی ملی بھگت سے یا صرف القاعدہ ہی کی ہمت سے ٹریڈ سنٹر کو تباہ کر گیا ہے تو پھر اسامہ نے دنیا کو یہ دکھا دیا ہے کہ واقعی

؎ مومن ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

افغانستان پر امریکہ کی اتنی تباہ کن کارروائیوں کے باوجود طالبان کے قائد ملّا عمر اور القاعدہ کے قائد اسامہ بن لادن امریکہ کے ہاتھ نہیں لگے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ لوگ اپنی بے سروسامانی کے باوجود لڑنے کی اعلیٰ ترین مہارت رکھتے ہیں۔مجھے یقین نہیں ہے کہ ایسا ہو سکتا ہے



لیکن اگر واقعی ایسا ہے تو پھر امریکہ اور اس کے حواریوں کے لئے دنیا میں کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔اسرائیل اپنی تمام تر غارت گری کے باوجود اور اپنی تمام تر جنگی حشر سامانیوں کے باوجود درحقیقت ایک نہیں،صرف آدھے ایٹم بم کی مار ہے۔اور امریکہ کو بخوبی علم ہے کہ کبھی سوویت یونین کی بعض سابق ریاستوں نے ایک طرح سے کھلے عام ایٹم بم بیچے تھے۔صرف اسرائیل تک ہی کیوں پھر ٹریڈ سنٹر کو کسی اسلحہ کے بغیر نابود کر دینے والے ''مومن'' تو کسی بھی طرح ایٹم بم امریکہ کے اندر تک پہنچا سکتے ہیں۔امریکہ اس قیامت کا سامنا کیسے کرے گا جب اس کے اپنے عظیم شہروں کو طالبان اور القاعدہ کے'' خود کش ایٹم بم'' اپنی لپیٹ میں لے لیں گے۔وہ لازماً یومِ حساب ہوگا۔

یہ میں نے امریکی الزامات کی بنیاد پر ایک مفروضے کی مکمل صورت دکھائی ہے۔اب امریکی حکومت سے بہتر کون جانتا ہے کہ ٹریڈ سنٹر پر ہوائی جہازوں کا حملہ کس کی سازش تھی۔اگر یہ امریکی اور اسرائیلی سازش تھی تو کم از کم امریکہ کو اپنے عالمی اخلاقیات،انسانی حقوق اور عالمی تمدن کے دعووں پر تو شرمندہ ہونا چاہئے۔لیکن اگر یہ واقعی کسی القاعدہ اور طالبان ہی کا ''کارنامہ'' تھا تو پھر امریکہ اور اسرائیل کو اپنے بچاؤ کی فکر کرنا چاہئے۔عام حملوں سے بچاؤ کی فکر نہیں۔''خود کش ایٹم بم حملوں'' سے بچاؤ کی فکر کرنا چاہئے۔کیونکہ جو لوگ خالی ہاتھوں سے آپ کے سروں پر اتنی ہولناک تباہی لا سکتے ہیں،وہ آپ کو ایٹمی تباہی کا نشانہ بھی آسانی سے بنا سکتے ہیں۔

اس منظر اور پس منظر سے ''امریکہ واسرائیل'' اور ''طالبان والقاعدہ'' کے عسکری کردار کے دونوں امکانی نقشے سامنے ہیں۔امریکہ اور اسرائیل کی بے فکری اور دہشت گردی کے خاتمہ کے نام پر انسانیت کی دھجیاں اڑانے والی کارروائیاں بتاتی ہیں کہ انہیں تو کسی کا خوف ہی نہیں۔اس سے دو ہی مطلب نکلتے ہیں۔یا تو یہ دونوں انتہائی چالاک ہیں کہ اپنا کیا دھرا اپنے فکری مخالفوں کے کھاتے میں ڈال کر ان سب کا تیا پانچہ کئے جا رہے ہیں اور یا پھر انتہائی بے وقوف ہیں کہ انتہائی خطرناک قسم کے دشمنوں کے امکانی خود کش ایٹمی حملے سے بے خبر ہوئے بیٹھے ہیں۔

میں ذاتی طور پر امریکہ اور اسرائیل کو اتنا بے وقوف نہیں سمجھتا۔اب اصل حقیقت کیا ہے؟ خود ہی جان لیجئے!

☆☆☆

# جہاد اور بعض اہم مذاہب کی تعلیمات

میں مذہبی معاملات کو چھیڑنا نہیں چاہتا لیکن اسلامی جہاد کو دہشت گردی کے ہوّے کے ساتھ جس طرح جوڑ دیا گیا ہے اس کے پیش نظر دیگر اہم مذاہب میں جہاد یا جنگ کے بنیادی تصور اور ان مذاہب کے پیروکاروں کے طریقِ کار اور حالیہ صورتحال پر ان کی تعلیمات کے شعوری یا غیر شعوری اثرات پر تھوڑی سی بات کروں گا۔ تا کہ اندازہ ہو کہ بعض اقوام کس طرح اپنے مذموم مقاصد کے لئے کرّہ ارض پر انسانیت کے لئے سنگین قسم کے خطرات پیدا کر رہی ہیں۔ اور اس کے لئے اسلامی تعلیمات کو مسخ کر کے حسبِ ضرورت پروپیگنڈہ کے طور پر استعمال کر رہی ہیں۔

سب سے پہلے ہندوستان میں کرشن جی مہاراج کی شہرۂ آفاق ''گیتا'' کو دیکھیں۔ یہ کتاب اپنی دوسری بہت ساری خوبیوں کے باعث مجھے ذاتی طور پر بھی پسند ہے اور ہندو مذہب سے ہٹ کر بھی اسے دوسرے علمی حلقوں میں ایک اہمیت حاصل ہے۔ ''گیتا'' کا لب لباب اگر پیش کیا جائے تو وہ ''جہاد'' کا کھلا اعلان اور جہاد سے ہٹنے کا ارادہ کرنے والوں کے اندر جہاد کا جذبہ پیدا کرنے کا پیغام ہے۔ اسلامی جہاد کے حوالے سے بعض قرآنی آیات سے اپنی مرضی کا استدلال کر کے، ان میں مین میخ نکال کر اعتراض کرنے والے ہندو اسکالرز کو بھی ''گیتا'' کا بھی اس زاویے سے مطالعہ کرنا چاہئے۔ جو حق اور سچ کے نام پر اپنے ہی خون کے مدِ مقابل لا کر کھڑا کر دیتی ہے۔ اور اس کے لئے مسلسل اکساتی ہے۔



حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت کا معاملہ یوں ہے کہ ویسے تو ان کے بارے میں از روئے قرآن بھی جو کچھ لکھا ہوا موجود ہے اسرائیلی انتہا پسندوں نے گزشتہ نصف صدی سے جاری اپنے ظلم وستم سے اور بار بار معاہدے کر کے ہر بار حیلوں بہانوں سے بدعہدی کر کے خود اس کا حرف حرف سچ ثابت کر دکھایا ہے۔ تاہم اس جگہ خود ان کی اپنی آسمانی کتاب ''عہد نامہ قدیم'' کی کتاب ''خروج'' (Exodus) سے دو حوالے پیش کروں گا۔ اس سے یہودیوں کو جہاد کی جو کھلی چھوٹ سامنے آتی ہے، گویا وہ اپنے مذہب کی تعلیم پر ہی عمل کر رہے ہیں۔ ''خروج'' میں یہودیوں کو یوں کھلے طور پر جنگ کرنے اور فتح ہی فتح کی بشارت درج ہے:

> ''میں تیرے دشمنوں کا دشمن اور تیرے مخالفوں کا مخالف ہوں گا۔ اس لئے کہ میرا فرشتہ تیرے آگے آگے چلے گا اور تجھے اموریوں اور حتّیوں، اور فرزّیوں اور کنعانیوں اور حوّیوں اور یبوسیوں میں پہنچا دے گا اور میں ان کو ہلاک کر ڈالوں گا۔ تو اُن کے معبودوں کو سجدہ نہ کرنا نہ اُن کی عبادت کرنا نہ اُن کے سے کام کرنا بلکہ تو اُن کو بالکل اُلٹ دینا اور اُن کے ستونوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالنا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔
> میں اپنی ہیبت تیرے آگے آگے بھیجوں گا اور میں اُن سب لوگوں کو جن کے پاس تو جائے گا شکست دوں گا۔ اور میں ایسا کروں گا کہ تیرے سب دشمن تیرے آگے اپنی پشت پھیر دیں گے۔۔۔۔۔ وہ تیرے ملک میں رہنے نہ پائیں تا نہ ہو کہ وہ تجھ سے میرے خلاف گناہ کرائیں'' (خروج باب ۲۳)

اسلامی جہاد کی بعض آیات سے استدلال کر کے اسلام کو نشانہ بنانے والے دانشور حضرات ذرا اس یہودی تعلیم کے مضمرات پر بھی غور کریں اور یہ بھی دیکھیں کہ کیا آج عملاً انتہا پسند اسرائیلی اسی ''یہودی جہاد'' کی تعلیم پر عمل نہیں کر رہے جو ان کے عہد نامہ قدیم میں درج ہے؟

اب اسرائیلی قوم کا مزاج بھی خود ان کی اپنی اسی کتاب ''خروج'' کے باب ۳۳ کی آیت ۳ میں دیکھ لیں۔ دوسری قوموں پر فتح کے بعد جو کچھ اسرائیلی کرتے ہیں اس حوالے سے یہ لکھا ہے:

''چونکہ تو گردن کش قوم ہے اس لئے میں تیرے بیچ میں ہو کر نہ چلوں گا تا ایسا نہ ہو میں تجھ کو راہ میں فنا کر دوں''

یہی بات پھر اسی کتاب اور اسی باب کی آیت ۵ میں یوں دہرائی گئی ہے:

''خداوند نے موسیٰ سے کہہ دیا تھا کہ بنی اسرائیل سے کہنا کہ تم گردن کش لوگ ہو۔اگر میں ایک لمحہ بھی تیرے بیچ چلوں تو تجھ کوفنا کردوں گا''

اب دیکھیں اسلامی تعلیمات میں ہے مفتوح اسلام قبول کرلے تو سب سے اچھا ہے ورنہ اسے جزیہ دینا ہوگا۔اس کے برعکس یہودی تعلیم یہ ہے کہ جس علاقہ کو فتح کروو ہاں کے باشندوں کو وہاں سے نکال دو۔ یہ ہے اصل ''یہودی جہاد'' جس پر بنیاد پرست یہودی مسلسل عمل پیرا ہیں۔خدا نے یہودیوں کے بارے میں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کہا ہے کہ یہ ''گردن کش'' لوگ ہیں۔اس لفظ کا مطلب ہے بغاوت اور نافرمانی کرنے والا، تکبر کرنے والا، اور شوخی کرنے والا شریر۔ ''یہودی قوم کی من حیث القوم گردن کشی'' کا یہ عالم ہے کہ خود ان کی اپنی کتاب کے مطابق خدا کہتا ہے کہ اے موسیٰ! اگر میں ایک لمحہ بھی ان کے بیچ چلوں تو انہیں فنا کردوں۔گویا یہ اتنے بے رحم، شریر اور سفاک لوگ ہیں کہ ان کا ہر لمحہ بے رحمی، سفاکی، شرارت، بغاوت اور نافرمانی کے بد اعمال میں گزرتا ہے۔کیا اس وقت بنیاد پرست یہودی ایریل شیرون اور اس کے ساتھی واقعتاً ایسے ہی کردار کا مظاہرہ نہیں کررہے؟

اور اب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امت کا حال بھی دیکھ لیں۔تعلیم کے لحاظ سے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اگر کوئی تمہارے دائیں گال پر تھپڑ مارے تو اپنا بایاں گال بھی اس کے آگے کر دو کہ لے بھائی تو اپنا غصہ پورا کرلے۔لیکن عملاً امریکہ کی سرپرستی میں مسیحی قوم کا عالمی کردار کیا ہے۔ایک طرف جونیئر بش اپنے پکے مسیحی ہونے کا ذکر کرتے ہیں دوسری طرف ان کے والد سے لے کر ان کی اپنی صدارت تک کا کردار یہ ہے کہ اگر کوئی تم سے اپنا دایاں حصہ بچانا چاہتا ہے تو اس کا بایاں حصہ بھی چھین لو۔عراق کے مسلمانوں پر امریکی حملہ، بوسنیا کے مظلوم مسلمانوں پر سربین مسیحیوں کے خوفناک مظالم، سے لے کر افغانستان پر بے رحمانہ بمباری کے تجربوں تک صرف اسی ایک عشرہ میں ہی دیکھ لیں کہ مسیحی تعلیم کا کیا مثالی نمونہ پیش کیا جارہا ہے اور پھر کس ناز کے ساتھ اپنے کٹر مسیحی ہونے کا اعلان بھی کیا جاتا ہے۔سوویت یونین کی شکست و ریخت کا عمل شروع ہوا تو ساری مسیحی اور یہودی ریاستیں بغیر کسی خون خرابہ کے سوویت یونین سے الگ ہوتی گئیں۔لیکن جیسے ہی مسلمانوں کی کثیر آبادی والی ریاستوں نے آزادی کے حصول کی جدوجہد شروع کی، خون خرابہ شروع ہوگیا۔مسلم آبادی والی کسی ایک ریاست کو بھی خون خرابہ کے بغیر



آزادی ملی ہو تو بتائیں۔چیچنیا کا مسئلہ ابھی تک معلق رکھا ہوا ہے۔کشمیر کا مسئلہ نصف صدی سے خون میں ڈوبا ہوا ہے۔اقوام متحدہ اپنی قرارداد کو فراموش کئے بیٹھی ہے۔اس کے برعکس انڈونیشیا میں مشرقی تیمور کی مسیحی آبادی کی آزادی کا سلسلہ شروع ہوا تو مہینوں میں اسے آزادی دلا دی گئی۔ یہ اس قوم کا کردار ہے جس کی تعلیم ہے کہ کوئی تمہارے دائیں گال پر تھپڑ مارے تو اپنا بایاں گال بھی اس کے آگے کر دو۔اس سب کچھ کے باوجود ''اسلامی جہاد'' کو فکری طور پر ہدفِ تنقید بنانے کے ساتھ مظلوم فلسطینی، کشمیری، چیچن مسلمانوں ہی کو دہشت گردوں میں شمار کرنا اور پھر کہنا کہ ہم مذہب اسلام کے خلاف نہیں ہیں۔

مجھے افسوس ہے کہ مجھے مذکورہ تینوں معروف اور اہم مذاہب کے جنگ سے متعلق نظریات اور اس کی عملی صورت کا اتنا اور اس رنگ میں جائزہ لینا پڑا۔

حال ہی میں جونیئر بُش روس کے دورہ پر گئے ہیں تو وہاں انہوں نے روسی صدر پیوٹن کے ساتھ گفتگو میں انہیں کہا ہے کہ روس ایران کو ایٹمی قوت بنا رہا ہے اور ایک دن ایرانی ایٹمی اسلحہ کا رُخ روس کی جانب ہوگا۔۔۔روسی حکام نے اس امریکی الزام کی تردید کی ہے تاہم یہاں میں امریکہ اور انڈیا دونوں کو وقت سے پہلے۔۔۔بہت پہلے۔۔۔بتا رہا ہوں کہ وہ سب انتہا پسند یہودی سازش میں گھرے ہوئے ہیں۔جب یہودیوں کا مسلمانوں سے کوئی معمولی سا ڈر بھی باقی نہیں رہے گا تب ہندوؤں کا کوئی مندر ان سے محفوظ نہیں رہے گا کیونکہ ان کی مذہبی تعلیم ہے کہ انہیں گرا دیا جائے۔اور تب مسیحی دنیا کو بھی یہی یہودی یاد دلائیں گے کہ سابقہ زمانوں میں مسیحیوں نے ان پر کیا کیا مظالم کئے تھے۔یہودی اپنا انتقام کس طرح لیتے ہیں؟ اور کیسے سازشیں کرتے ہیں؟ یہ تب ہی امریکہ اور یورپ کو معلوم ہو سکے گا۔

اگر ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی، مسلسل سامنے آتے ہوئے شواہد کی بنیاد پر یہودیوں ہی کا کیا دھرا ہے تو پھر ابھی ان کی ''گردن کش'' حرکتوں کا سلسلہ جاری رہے گا۔اس کی ایک جھلک ان دو خبروں میں دیکھئے۔دونوں خبریں ایک ہی دن (۱۵ مئی ۲۰۰۲ء) کے روزنامہ جنگ میں آئی ہیں:

''اسلامی انتہا پسند ۴ رجولائی کو ایٹمی پلانٹس پر حملہ کر سکتے ہیں، امریکہ

واشنگٹن۔۔۔امریکا کے سمندری محافظوں نے اپنی حکومت کو آگاہ کیا ہے کہ انہیں پچیس اسلامی

انتہا پسندوں کے امریکا میں داخلے کے بارے میں اطلاعات ملی ہیں جو چار جولائی کو امریکا کے ایٹمی پلانٹس پر دہشت گرد حملہ کر سکتے ہیں۔فاکس نیوز کے مطابق امریکی محافظوں نے ایک ایسی دستاویز پکڑی ہے جس سے انتہا پسندوں کے امریکا میں داخلے کا پتہ چلتا ہے۔“

مجھے لگتا ہے کہ امریکی محافظوں کو ملنے والی دستاویزات خود یہودی ”گردن کشی“ کی کوئی صورت ہے۔یعنی خود سازش کر کے مسلمانوں کے سر الزام لگا دیا جائے۔اس کا اندازہ اسی روز کی دوسری خبر سے آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔دوسری خبر یہ ہے:

## ”امریکا: ٹرک میں دھماکہ خیز مواد کی موجودگی پر 2 اسرائیلی گرفتار

سیاٹل: امریکی بحریہ کے اڈے کے نزدیک پولیس نے دھماکہ خیز مواد کی موجودگی کے شبہے میں ایک ٹرک قبضے میں لے لیا ہے، جسے 2 اسرائیلیوں نے کرائے پر لیا تھا۔فوکس نیوز کے مطابق ٹرک کے گیر لیور اور اسٹیرنگ سے پی این ٹی اور فوجی استعمال میں آنے والے دھماکا خیز مواد کی موجودگی کے آثار ملے ہیں۔اسے ریاست واشنگٹن میں امریکی بحری اڈے کے نزدیک ٹاؤن اوک ہاربر میں قبضے میں لیا گیا۔اس ٹرک کو 2 اسرائیلیوں نے کرائے پر لیا تھا، جنہیں غیر قانونی طور پر امریکا میں داخل ہونے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا ہے۔“

ٹریڈ سنٹر پر حملہ سے لے کر آنے والے دنوں کی ”گردن کش“ ریشہ دوانیوں کی بنیاد پر انتہا پسند یہودی جو کھیل، کھیل رہے ہیں اس کا فوری خمیازہ بے شک مسلمان ہی بھگت رہے ہیں لیکن اگر یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا اور یہودی سازشیں مسلمانوں کے کھاتے میں لکھی جاتی رہیں تو پھر ایک وقت آئے گا جب ساری مسیحی دنیا۔۔۔اسرائیل کی زد پر ہوگی۔اور ان کے ساتھ جو کچھ ہوگا وہ اس سے کہیں زیادہ ہوگا جو اس وقت مسلمانوں کے ساتھ ہو رہا ہے۔

جونیئر بُش نے ایران کی ایٹمی صلاحیت کے حوالے سے جو کچھ روسی صدر پیوٹن سے کہا ہے، ویسا کبھی نہیں ہوگا لیکن اگر امریکا اور اہل یورپ نے اسرائیل اور مسلم ممالک کے تئیں اپنی پالیسی تبدیل نہ کی تو یہ ایک حقیقت ہے کہ ایک دن امریکا اور یورپ اسرائیل کی زد پر ہوں گے۔

☆☆☆



# امریکہ، ایشیا اور جنوبی ایشیا

اس وقت دنیا کی سب سے بڑی ظاہری طاقت امریکہ ہے۔دنیا اس طاقت کا ادراک رکھتی ہے۔لیکن ایسے لگتا ہے کہ جیسے امریکی حکمران اپنی تمام تر قوت کے باوجود کسی نفسیاتی کمی کے باعث اس طاقت کے اظہار کے لئے بہانے تلاش کرتے رہتے ہیں اور اب تو اسے بہانوں کی تلاش کی حاجت بھی نہیں رہی۔بس جو کہہ دیا وہی فیصلہ ہے، وہی حکم ہے۔

یورپی ممالک کے ساتھ امریکی تعلق کسی قسم کی بڑی کشیدگی سے پاک اور دوستانہ ہے۔اگرچہ ”دہشت گردی“ کے خلاف حالیہ عالمی امریکی ”کاروائیوں“ پر یورپ کے عوام کا ایک حصہ ناراضی کا اظہار کر رہا ہے اور اس ناراضی کا اظہار اس وقت سامنے آ گیا جب مئی کے آخری عشرہ میں امریکی صدر بُش جرمنی، روس اور فرانس وغیرہ ممالک کے دورے پر گئے اور ہر جگہ ان کے خلاف بڑے پیمانے پر سخت قسم کے جلوس نکالے گئے اور خود امریکہ کو اور صدر بُش کو عالمی دہشت گرد قرار دیا گیا۔تاہم اس کے باوجود عمومی طور پر یورپ کے ساتھ امریکی مراسم اعتماد والی دوستی کی حد تک ہیں۔یوں بھی سارے یورپ میں امریکی فوجی اڈے قائم ہیں۔سوویت یونین روس کے دور سے قائم یہ فوجی اڈے بھی اعتماد ہی کی کوئی صورت ہیں۔

ایشیا کے مختلف ممالک کے ساتھ امریکی حکومت کے تعلقات کی نوعیت مختلف النوع ہے۔

جاپان امریکی ایٹم بم کا شکار ہونے والا دنیا کا واحد ملک ہے۔جب سے اس نے جنگی تیاریوں

سے یکسر منہ موڑ کر اقتصادی ترقی کی طرف توجہ کی ہے،اس نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔اگر یہ کہا جائے کہ میدانِ جنگ میں ہارنے والے جاپان نے اقتصادی میدان میں امریکہ کو شکست دے رکھی ہے تو بے جا نہ ہوگا۔جن میدانوں میں جاپانی شہرت رکھتے ہیں،ان میں امریکی ان کے برابر بھی نہیں پہنچتے،آگے نکلنا تو بعد کی بات ہے۔

عرب ممالک کے امریکہ کے ساتھ مراسم انتہائی نیاز مندانہ ہیں۔اگر چہ عراق اور شام کو امریکہ نے زد پر رکھا ہوا ہے تاہم عمومی طور پر عرب بادشاہوں کا سارا حلقہ امریکہ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہے۔ان کی بادشاہتوں میں امریکی عمل دخل سعودی حکمرانوں کے آغاز سے چلا آ رہا ہے۔اس کے باوجود عرب اسرائیل تنازعہ میں امریکی حکمرانوں کا کردار اتنا افسوسناک رہا ہے کہ امریکہ نے بے اصولی کی ہر حد کو پار لیا ہے۔اسی کا نتیجہ ہے کہ عرب عوام میں امریکی حکومت کے خلاف شدید نفرت پیدا ہوتی جا رہی ہے۔یہ نفرت جس انداز سے بڑھ رہی ہے شاید ایک وقت آئے کہ پھر خود امریکہ کے من پسند بادشاہوں کے تخت بھی الٹ جائیں اور عرب ممالک میں ایران جیسے انقلاب برپا ہونے لگیں۔اگر چہ اس وقت سعودی عرب میں شہزادہ عبداللہ جیسے موثر کردار بھی ابھرے ہیں لیکن افسوس یہ ہے کہ ایسے کردار تو آج سے ۵۰ سال پہلے شروع ہونے چاہئیں تھے۔شاید اب بہت تاخیر ہو گئی ہے۔۔۔اور یہ بھی ممکن ہے کہ ابھی بھی کچھ بچت ہو جائے۔

عراق،اور شام کی طرح امریکہ نے ایران کے آزادانہ کردار کے باعث اسے بھی بلیک لسٹ کر رکھا ہے۔اور اس کی بنیاد کسی عالمی اصول پر نہیں بس امریکی حکمرانوں کی ذاتی ناپسند پر ہے۔شاہ ایران کے زمانے میں ایران کی سلطنت ایشیا میں امریکی پولیس مین سمجھی جاتی تھی لیکن انقلاب ایران کے بعد امریکہ کو یہاں سے خاصا بے آبرو ہو کر نکلنا پڑا۔شاید اسی لئے امریکہ ابھی تک ایران کی قیادت سے ناراض ہے۔

روس اپنی موجودہ حالت میں امریکہ کا دوست بھی ہے اور کئی معاملات میں دست نگر بھی ہے۔اس لئے ابھی وہ نہ تو امریکہ کے لئے کسی قسم کا چیلنج بن سکتا ہے اور نہ ہی بننا چاہتا ہے۔اس لئے روس کی طرف سے بھی راوی ابھی چین ہی چین لکھ رہا ہے۔لیکن چین ایسی عظیم مملکت کو امریکہ نے اپنے لئے جان بوجھ کر ایک ہوّا بنا لیا ہے۔کیمونزم کے سب سے بڑے مرکز



سوویت یونین کو افغانستان کے ''مجاہدین'' کے جذبۂ جہاد کے بل پر توڑ دینے کے باوجود امریکہ کے حکمران سوشلزم اور کیمونزم کے خوف سے باہر نہیں آ رہے۔ایک طرف کیوبا کے صدر کاسترو امریکی حکمرانوں کی ناک پر لڑے ہوئے ہیں تو دوسری طرف چین کو اپنے لئے خطرہ سمجھا جا رہا ہے۔حالانکہ اگر چین کی پالیسیوں کو دیکھا جائے تو وہ بقائے باہمی کے اچھے اصولوں پر عمل پیرا ہے۔اور کسی کے لئے بھی ناجائز طور پر دھمکی اور کھڑکا نہیں بنا ہوا۔

ہندوستان اور پاکستان کے معاملات میں صورت حال خاصی مشکل ہوتی جا رہی ہے۔پاکستان اپنے قیام کے اول روز سے امریکہ کے ساتھ دوستی کا دَم بھرتا آیا ہے۔اپنے مشرقی آدابِ دوستی اور معیارِ دوستی کی بنیاد پر پاکستان امریکہ سے بھی محبت کے ویسے ہی سلوک کا متمنی رہا جیسا وہ خود امریکہ کے لئے کر رہا تھا۔لیکن پاکستان کی پوری تاریخ بتاتی ہے کہ امریکہ نے پاکستان کو ہمیشہ اپنے مخصوص مفادات کے لئے استعمال کیا اور بڑی محبت کے ساتھ استعمال کیا اور ہر بار مطلب نکل جانے کے بعد نہ صرف نگاہیں پھیر لیں بلکہ پاکستان کے لئے مشکلات بھی پیدا کیں۔

ہندوستان کے ساتھ امریکی تعلقات ایک ڈپلومیٹک حد تک رہے۔اس حد کے اندر بھی ہندوستان نے امریکہ سے ایسے مفادات حاصل کر لئے جو مجموعی طور پاکستان کو نہیں مل سکے۔نیو یارک میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی دونوں عمارتوں کی تباہی کے بعد سے امریکی حکمرانوں نے اب جو نئے طور طریقے اختیار کر رکھے ہیں،ان کے نتیجہ میں خاص طور پر جنوبی ایشیا شدید خطرات سے دوچار ہو گیا ہے۔پاکستان سے محبت کی پینگ بڑھا کر افغانستان میں تباہی پھیلانے کے بعد اب امریکہ نے ہندوستان کے ساتھ محبت کی پینگ بڑھا لی ہے۔اور میرا خیال ہے کہ اس کے نتیجہ میں ہندوستان اپنی تاریخ کے سب سے بڑے بحران سے دوچار ہو گیا ہے۔

امریکہ کا سارا رومانس اس لئے ہے کہ ہندوستان کو چین سے لڑایا جائے۔اِدھر ہندوستان کو بخوبی علم ہے کہ وہ چین سے لڑنے کی پوزیشن میں نہیں ہے لیکن وہ امریکی التفات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش بھی کر رہا ہے۔۔۔چنانچہ اس وقت کھیل یہ چل رہا ہے کہ جب امریکہ نے ہندوستان کو ''میرا بھارت مہان'' کہہ کر چین کے لئے تھپکی دی تو ہندوستان کی موجودہ فرقہ پرست قیادت نے اپنی چال چلی۔انہوں نے کہا ٹھیک ہے صاحب ہم چین سے نمٹیں گے،لیکن پہلے ہمیں پاکستان سے نمٹ لینے دیجئے کیونکہ یہ اپنے قیام ہی سے ہمارے لئے دردِ سر بنا ہوا ہے

۔اب اپنی تھپکی کا بھرم رکھنے کے لئے امریکہ ہندوستان کو چھوٹ دے رہا ہے۔اس چھوٹ کے نتیجہ میں احمد آباد میں گزشتہ صدی کے سب سے ہولناک اور انتہائی شرمناک ہندو مسلم فسادات ہوئے،مسلمانوں کو منصوبہ بند طریقے سے زندہ جلایا گیا،عصمتیں تار تار کی گئیں،حاملہ عورت کا پیٹ چاک کر کے بچے کو قتل کرنے تک کے گھناؤنے واقعات ہوئے۔۔۔اس کے ساتھ ہی کشمیر کے معاملے میں اقوام متحدہ اپنی ہی منظور کردہ قراداد سے لاتعلق ہوگئی۔کشمیر میں آٹھ لاکھ کے لگ بھگ بھارتی فوج کے مظالم میں شدت آ گئی اور پاکستان کے ساتھ گزشتہ چھ ماہ سے حالت جنگ جیسی کیفیت طاری کر دی گئی۔کسی مسئلے پر بات چیت کرنے کے لئے مسلسل انکار کیا جانے لگا۔یہ سب امریکی تھپکی کا نتیجہ ہے۔بظاہر ایسا لگتا ہے کہ امریکہ نے موجودہ ہندوستانی حکمرانوں کو بہت رعائت دے دی ہے۔لیکن حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔بلکہ ہندوستان امریکی جال میں پھنس گیا ہے۔

کشمیر کا سیاسی حل امریکہ کی ضرورت ہے۔وہ کشمیر کے سلسلے میں اپنی دو اہم ترجیحات رکھتا ہے۔ایک یہ کہ کشمیر میں ویسے ہی جہادی گروپ اقتدار پر نہ آ جائیں جیسے افغانستان میں آ گئے تھے۔دوسرے وہ اس خطے پر اپنا اتنا زیادہ کنٹرول رکھنا چاہتا ہے کہ اس طرف سے بھی چین پر نظر رکھ سکے۔ہندوستانی حکمران اگر امریکی محبت کے جال میں پھنس گئے ہیں تو اب انہیں پاکستان کے ساتھ اپنے جنگی نفسیاتی حربے آزمانے کے بعد بہر حال کشمیر کے مسئلہ کے حل کی طرف آنا ہی ہوگا۔دوسرے چین کے ساتھ ’’پنگا‘‘ بھی کرنا ہوگا۔جس دن ہندوستان نے چین سے ’’پنگا‘‘ کرنے سے انکار کیا اسی دن امریکی رویہ دیکھنے والا ہوگا۔بعد کی باتیں تو بعد میں ہوتی رہیں گی۔امریکہ نے اور اسی کی ایما پر دوسرے مغربی سفارتکاروں نے پاکستان کو چھوڑنے کے ساتھ ہندوستان کو بھی چھوڑنا شروع کر دیا ہے۔اگر ہندوستان کے موجودہ حکمرانوں میں عقل ہے تو وہ سمجھیں کہ سفارت کاروں کے اس عمل سے انہیں ڈپلومیٹک سطح پر شدید دھچکا پہنچا ہے اور یہ دھچکا ان دنوں میں پہنچا ہے جب ابھی امریکہ سے ان کا ’ہنی مون‘‘ پیریڈ چل رہا ہے۔

ایسے وقت میں جب پاکستان اور ہندوستان کے درمیان ایٹمی جنگ کے شدید خطرات پوری طرح زائل نہیں ہوئے۔ہندوستان کی افواج کی سرحدوں پر چھ ماہ سے مسلسل موجودگی،انتہا پسند ہندو جماعتوں کا دہشت گردانہ کردار،اقلیتوں کے خلاف شدید قسم کا جارحانہ رویہ،ایسے عوامل ہیں جن کے باعث ہندوستان کی جمہوریت بھی شدید خطرات میں گھر گئی ہے۔اگر ایسے کسی وقت



میں ہندوستانی فوج موجودہ حکمرانوں کا تختہ الٹ دے تو اسے بعید از قیاس نہیں سمجھیں۔اگر کوئی حتمی قدم نہ اٹھایا گیا اور غیر یقینی کی موجودہ صورتحال برقرار رہی تو میرے نزدیک ہندوستان میں کسی وقت بھی فوج اقتدار سنبھال سکتی ہے۔ایسا ہوا تو بے شک یہ ہندوستانی جمہوریت کے لئے سخت صدمہ ہوگا لیکن اس کی تمام ذمہ داری بی جے پی کی موجودہ قیادت اور انتہا پسند ہندوؤں پر عائد ہوگی۔رہا امریکہ تو جیسے پاکستان میں پرویز مشرف کی حکومت ہو یا بے نظیر بھٹو کی یا میاں نواز شریف آ جائیں،امریکی مفادات محفوظ ہیں،ویسے ہی اب امریکہ جس حد تک ہندوستان کے اندر گھس آیا ہے اس کے بعد ہندوستان میں امریکی مفادات بھی ہر حال میں محفوظ رہیں گے۔

☆☆☆

# امریکا اور ہم

ابھی تک میں نے زیادہ تر امریکہ کے ان اقدامات کی نشاندہی کی ہے جو ”جس کی لاٹھی اُس کی بھینس“ کے مطابق آج کی دنیا میں ایک غیر منصفانہ، غیر عادلانہ اور کھلے جابرانہ انداز کو فروغ دے رہے ہیں۔ اوران کا نشانہ زیادہ تر مسلمان اور بڑی حد تک تیسری دنیا کے غریب عوام ہیں۔ آج میں اپنی کچھ ایسی کمزوریوں، غلطیوں اور حرکتوں کا مختصراً ذکر کروں گا جس کے نتیجہ میں ہم سب اس حال کو پہنچے ہوئے ہیں۔

بیشتر اسلامی ممالک کا کردار ہمیشہ سے امریکہ نواز رہا ہے۔ اسے امریکہ سے مخلصانہ دوستی بھی کہا جا سکتا ہے لیکن اس کی وجہ زیادہ تر یہ رہی کہ اسلامی ممالک کی شاہانہ اور آمرانہ حکومتوں نے اپنے ذاتی استحکام پر توجہ مرکوز رکھی اور ملک اور قوم کے استحکام کو ثانوی بلکہ جزوی حیثیت دی۔ اسلامی ممالک کی جو مختلف تنظیمیں بنی ہوئی ہیں ان کی حیثیت بھی نہ ہونے کے برابر ہے۔ اسلامی ممالک کو درپیش حالیہ سنگین بحرانوں کے دوران اسلامی ممالک اور ایسی تنظیموں کا کردار افسوسناک ہی نہیں انتہائی شرمناک رہا ہے۔ اگر ایسی حکومتیں اور ایسی تنظیمیں اتنی ناکارہ ہیں تو پھر عوام کو امریکہ کے ہاتھوں کیوں مروایا جا رہا ہے۔ یہ جو اَب بعض امریکہ مخالف حلقوں کی طرف سے افغانستان پر حامد کرزئی کی حکومت پر مختلف قسم کے طنز کئے جا رہے ہیں۔۔۔ سارے



طنز بجا ہیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ امریکہ کے نیاز مند سارے اسلامی ممالک کے حکمران حامد کرزئی سے بھی بڑھ کر امریکی مفادات کے نگہبان ہیں اور اس نگہبانی کی قیمت پر ہی ان کا اقتدار سلامت ہے۔ تو پھر اکیلا حامد کرزئی ہی کیوں ہدفِ تنقید ہو جبکہ سارے اسلامی ممالک کے حکمران ہی اپنی اپنی جگہ حامد کرزئی بنے ہوئے ہیں۔

چونکہ میرا تعلق پاکستان سے ہے اس لئے میں پاکستان کے اندر کے حالات کے حوالے سے چند اہم امور کی نشاندہی کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ من حیث القوم ہمارے دامن پر بہت سارے داغ ہیں۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں ”ہاکس بے“ پر قوم کی معصوم بچیوں پر کھلے عام جنسی حملے ہوتے ہیں اور حملہ کرنے والے بھی ہم میں سے ہی تھے۔ اسی ملک میں جاگیردارانہ معاشرے میں غریب افراد کو کسی مخالفت کی سزا دینے کے لئے ان کے خاندان کی عورتوں کو سرِ بازار ننگا کر کے چلایا جاتا ہے اور ہم سارا تماشہ دیکھتے رہتے ہیں۔ کسی سیاسی بدمعاش کی کسی سے دشمنی ہوتی ہے تو اعتکاف میں بیٹھی ہوئی عورت کو اعتکاف سے اٹھا کر اسے بے آبرو کر دیا جاتا ہے اور اسے معمولاتِ زندگی میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ ہمارے معاشرے کے اخلاقی کردار کا ایک پہلو ہے۔

سیاستدانوں کا مجموعی کردار یہ ہے کہ جب سیاسی حکومتیں ہوتی ہیں تو ایک دوسرے کا جینا دوبھر کر دیتے ہیں۔ ایک دوسرے پر سنگین الزامات ہی عائد نہیں کرتے، جھوٹے سچے مقدمات بھی قائم کرتے رہتے ہیں۔ انتقام کا ایسا سنگین ماحول ہوتا ہے جس میں دوسروں کے خلاف جو کچھ بھی ناجائز سے ناجائز کر دیا جائے، جائز قرار پاتا ہے۔ ایسے انتقامی ماحول میں جب فوجی حکومت آجاتی ہے تو پھر ایک دوسرے کو ذلیل کرتے چلے جانے والے بڑے مزے سے ہم نوالہ و ہم پیالہ ہو جاتے ہیں۔ جمہوریت کے علمبردار بن کر آمریت کا خاتمہ کرنے کے لئے متحد ہو جاتے ہیں اور اس سارے کھیل میں عوام کے حصے میں سوائے بھوک اور بڑھتی ہوئی غربت کے کچھ نہیں آتا۔ ہر کسی نے اس ملک کو لوٹا ہے اور نہایت بے دردی سے لوٹا ہے۔ اس کے باوجود کمال یہ ہے کہ جو جتنا بڑا لٹیرا ہے وہی اتنا بڑا مصلحِ قوم ہے۔

علماء کی فرقہ پرستی نے ملک کو الگ سے جہنم بنا کر رکھ دیا ہے۔ آئے دن مسجدوں اور امام باڑوں میں ہونے والے دھماکوں نے اسلام کی ایسی تصویر بنا دی ہے جسے ایکسپلائٹ کرنے کے

لئے اہلِ مغرب کو زیادہ محنت نہیں کرنا پڑتی۔اس سب کچھ کے ساتھ خود کٹڑ اسلامی حلقے کے ایک معتبر صحافی کے بقول علماء کے کردار کا ایک روپ یہ بھی ہے۔

''شریف صاحب مسکرائے، گھڑی پر نظر دوڑائی اور کہا کہ میں ذرا نماز پڑھ لوں۔نماز ادا کرنے کے بعد وہ دوبارہ کرسی پر آ بیٹھے اور بڑی بے شرمی سے کہنے لگے۔'میاں شام کا وقت ہے کوئی دارو وغیرہ کا بندوبست کرو'۔نماز کے فوراً بعد دارو کے تقاضے پر پاکستان کے کئی باریش علماء اور دانشوروں کے چہرے میری نظروں کے سامنے گھومنے لگے جو دارو پی کر اللہ اور اس کے رسولؐ کے حوالے دینے میں کوئی شرم محسوس نہیں کرتے''

(کالم ''قلم کمان'' از حامد میر۔ڈیلی اوصاف اسلام آباد انٹرنیٹ ایڈیشن۔۱۶ مئی ۲۰۰۲ء)

ہماری عدلیہ کا کردار کسی دور میں بھی مثالی نہیں رہا۔حتیٰ کہ کبھی کبھار جو حق گوئی کا کوئی ایک آدھ نمونہ سامنے آتا ہے تو بعد میں پتہ چلتا ہے کہ ان نے بھی فلاں پارٹی سے کوئی بڑی ڈیل کر لی تھی۔فی ذاتہٖ حق گوئی کا وہ نمونہ بھی کسی ڈرامے کا کردار ہی ادا کر رہا ہوتا ہے۔پولیس کا کردار اتنا گھناؤنا ہے کہ ظلم کی لاکھوں کروڑوں داستانیں رقم ہو سکتی ہیں۔حالیہ دنوں میں انڈیا نے پاکستان کے خلاف حربے کے طور یہ سلسلہ شروع کیا ہے کہ مختلف حوالوں سے طالبان اور القاعدہ کے نام انڈیا میں ہونے والے واقعات سے جوڑ رہا ہے۔انڈیا میں فلاں دہشت گردی کے واقعہ میں طالبان ملوث ہیں، القاعدہ والے شامل ہیں۔انڈیا کی تو اس وقت پاکستان کے ساتھ دشمنی چل رہی ہے اور ایسے مواقع پر دشمن ہر جھوٹ سچ سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔لیکن پاکستانی پولیس تو اپنے عوام، اپنے شہریوں کی محافظ ہے۔اس کی چیرہ دستیوں کا یہ عالم ہے کہ طالبان اور القاعدہ کی موجودہ صورتحال کو اس حد تک ایکسپلائٹ کرنے لگے ہیں کہ کسی شہری کو کسی چھوٹے موٹے چکر میں پکڑا اور اس سے بڑی رقم بطور رشوت اینٹھنے کے لئے اسے دھمکی دے دی کہ اتنی رقم مہیا کرو، ورنہ تمہیں طالبان یا القاعدہ کا بندہ بنا کر کیس رجسٹر کر لیں گے۔اور ابھی تک ایسا ہو رہا ہے۔جس قوم کی محافظ پولیس اتنی بے رحم اور سفاک ہو پھر اس قوم کا تو اللہ ہی حافظ ہے۔

یہ پاکستان کے حوالے سے چند اہم امور تھے جن سے ہمارے قومی زوال کے اسباب کو کسی حد تک سمجھا جا سکتا ہے۔اگر ہمارے اسلامی ملکوں کے اپنے معاشرے عدل و انصاف سے عاری اور ظلم و ستم کے مرکز بنے ہوئے ہیں تو پھر امریکہ کی حکومت بھی تو ہمارے ساتھ وہی کچھ کر رہی ہے



جو ہم خود اپنوں کے ساتھ کر رہے ہیں۔فرق یہ ہے کہ ہم اپنے اپنے محدود دائرے میں ایسا کر رہے ہیں، جبکہ امریکی حکومت اپنے پورے پھیلاؤ میں ایسا کر رہی ہے۔

میں جب امریکہ کے خلاف لکھتے ہوئے ان کے کسی ظلم یا زیادتی کی نشاندہی کرتا ہوں تو میرے پیش نظر امریکی حکومتیں ہوتی ہیں۔امریکی عوام نہیں۔شاید یہی وجہ ہے کہ پاکستان کے عوام جہاں امریکی حکومتوں کی غیر متوازن پالیسیوں سے شدید شاکی ہیں وہیں امریکہ کی سلطنت اور اس کے عوام کے لئے ان کے دل میں قدر بھی ہے اور کشش بھی۔یہاں مجھے وہ زمانہ یاد آ گیا ہے جب پاکستان میں سلمان رُشدی کے خلاف جلوسوں کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔جن دنوں میں جلسہ جلوس میں شدت آ گئی تھی، انہیں دنوں میں امریکی حکومت نے اپنے پہلے لاٹری ویزہ پروگرام کا اعلان کر دیا اور پھر دنیا نے دیکھا کہ وہی لوگ جو امریکی سفارت خانے پر پتھراؤ کر رہے تھے، امریکی سفارت خانے کے باہر لمبی لمبی لائنوں میں لگ کر ویزہ لاٹری کے مقررہ فارم حاصل کرنے کی تگ و دو کر رہے تھے اور اس کے ساتھ ہی سلمان رُشدی کے خلاف جلوسوں کا سلسلہ بھی رُک سا گیا۔

من الحیث القوم پاکستانیوں کا یا ساری دنیا کے مسلمانوں کا، یا تیسری دنیا کے لوگوں کا جائزہ لیں تو ایسے لگتا ہے کہ ایک چھوٹا سا امریکہ ہم سب کے اندر چھپا ہوا ہے۔اپنے اپنے دائرہ کار میں ہم بھی اتنے ہی غیر منصف، بے رحم اور ظالم ہیں جتنا کہ ہماری دانست میں امریکہ ہے۔ایسی تمام سیاسی یا دینی جماعتیں جو اپنے کسی محدود دائرے میں، یا اپنے ملک میں یا دنیا میں عادلانہ نظام کی علمبردار ہیں، ان کو بنظرِ غائر دیکھیں تو اپنے اندرونی طریقِ کار میں وہ امریکہ سے بھی زیادہ ظالم اور بے انصاف دکھائی دیں گی۔بس بات صرف اتنی ہے کہ ان کے ظلم کا دائرہ ان کی پہنچ کی حد تک ہے، ورنہ ان کا بس چلے تو امریکہ سے بڑھ کر کام کر دکھائیں۔شاید ہم مظلوم اس لئے ہیں کہ ہمارے بس میں کچھ نہیں ہے۔اگر ہمارے بس میں ہو تو ہمارے اندر کا امریکہ بھی دریافت ہونے میں دیر نہیں لگے گی۔۔ابھی بھی ہم اپنوں کے ساتھ جو کچھ کر رہے ہیں وہ ہمارے اندر کے امریکہ کی نشاندہی کرنے کے لئے کافی ہے۔لیکن ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ایک بہت بڑی خوبی تو ہے کہ یہ لوگ اپنی قوم کے افراد کو بلاتخصیص ایک عزت اور اہمیت دیتے ہیں اور ایک دو جان واکر جیسے کرداروں کو چھوڑ کر تا حال مجموعی طور پر اس قوم کے لوگ اپنے وطن کے غدار نہیں ہیں جبکہ ہماری

تاریخ ہر طرح کے غداروں سے بھری پڑی ہے اور ابھی بھی ہمارے ہی کتنے سیاستدان،صحافی،بیوروکریٹس،مذہبی لوگ۔۔۔کتنے ہی لوگ قوم کا سودا کرنے کے لئے امریکہ کے اشارے اور مناسب حق الخدمت کے منتظر ہیں۔

امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے مجموعی کردار کو اس زاویے سے بھی دیکھیں کہ کہیں یہ سب کچھ خدا کی طرف سے ہمارے اجتماعی گناہوں کی سزا تو نہیں ہے؟

☆☆☆



# فلسطینیوں کے لئے جانوروں جتنے حقوق کی اپیل

امریکی حکومت کی غیر منصفانہ پالیسیوں اور عدم توازن کو بڑھاتے چلے جانے والے اقدامات پر خود امریکہ کے اندر سے ردِعمل آنے کی ابتدا ہوگئی ہے اور امریکہ کی حلیف حکومتوں کی طرف سے بھی سگنل ملنے شروع ہوگئے ہیں۔بعض امریکی دانشور تو پہلے دن سے ہی امریکی ظلم وستم کے خلاف آواز اٹھا رہے ہیں لیکن اس بار مغربی میڈیا کے ایک طاقتور ترین ذریعہ ’’سی این این‘‘ اور ’’اے او ایل‘‘ کے ایک اعلیٰ ترین عہدیدار نے ایک انٹرویو میں اسرائیلی ظلم وستم کے خلاف اور فلسطینیوں کے حق میں ’’کلمۂ حق‘‘ کہا ہے۔جس کی امریکی حکمران اور یہودی لابی کو بالکل توقع نہ تھی۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہودیوں کے حق میں لکھنے پر مامور ذرائع ابلاغ بھی جھوٹ بولتے بولتے شرمندہ ہونے لگے ہیں۔پتھر چلانے والوں کو دہشت گرد اور گولیوں،گولوں،ٹینکوں کے ساتھ حملہ آور ہونے والوں کو مظلوم کہنے کے ظلم کی بھی حد ہوتی ہے۔آخر یہ جھوٹ بولنے والے خود ہی اپنے جھوٹ پر شرمندہ ہو کر ایک اخباری انٹرویو میں سہی،لیکن کچھ سچ تو بولنے لگے۔

اس سے زیادہ اہم بیان برطانیہ کے وزیر اعظم ٹونی بلیئر کی اہلیہ نے دیا۔جنہوں نے

فلسطینیوں کے خودکش حملوں کا ایک منصفانہ انداز میں جواز پیش کیا۔اگرچہ بعد میں برطانوی حکام اپنی وضاحتیں پیش کرتے رہے لیکن شیری بلیئر کے بیان سے برطانوی عوام کی سوچ میں ہوتی ہوئی تبدیلی کا ادراک کیا جا سکتا ہے۔شاید ایسے بیان سے حوصلہ پا کر مصر کی الازہر یونیورسٹی سے بھی ایک جرات مندانہ فتویٰ آ گیا ہے کہ اپنے حقوق کے لئے لڑتے ہوئے اپنی جان دینے والے فلسطینی اور کشمیری دہشت گرد نہیں بلکہ شہید ہیں۔لیکن سب سے اہم بیان برطانیہ میں سعودی عرب کے سفیر غازی القیتی کا ہے۔انہوں نے صاف لفظوں میں کہا کہ اگر وہ نوجوان ہوتے تو خود فلسطینیوں کے حق کے لئے لڑتے اور خودکش حملے کی بہادری دکھاتے۔انہوں نے خودکش حملوں کو دہشت گردی ماننے سے انکار کیا اور ایسے حملوں کو حق بجانب قرار دیا۔ان کے بیان کا سب سے اہم حصہ وہ ہے جس میں انہوں نے موجودہ ''مہذب دنیا'' سے درخواست کی کہ میں فلسطینیوں کے لئے انسانی حقوق کا مطالبہ نہیں کرتا، میں صرف اتنا کہتا ہوں کہ جتنے آپ کے نزدیک جانوروں کے حقوق ہیں اتنے حقوق تو فلسطینیوں کو دے دیں۔

سعودی عرب کے شہزادہ عبداللہ نے جو حالیہ دنوں میں تھوڑی سی جرأت دکھائی تھی، غازی القیتی کا بیان دراصل اسی جرأت کی توسیع ہے۔خدا کرے ہمارے سعودی حکمران طبقے میں پیدا ہونے والی نیم بیداری کی یہ حالت مکمل بیداری میں بدل جائے۔بے شک اس وقت عرب دنیا ایک طرح سے امریکی جال میں پھنسی ہوئی ہے لیکن اگر ذاتی مفادات کو چھوڑ کر قوم کے مفادات کا ادراک کر لیا جائے تو ابھی بھی عالمِ عرب اور عالمِ اسلام کو ذلت کی موجودہ حالت سے نکالا جا سکتا ہے۔شاید سعودی عرب اور مصر کے ان حالیہ روّیوں کے نتیجہ میں اب مسلمانوں کی عالمی تنظیم میں بھی تھوڑی سی جان پڑنے لگی ہے۔

ان معمولی سی تبدیلیوں کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اسرائیل کے وزیرِ دفاع بن یامین نے بھی تسلیم کیا ہے کہ ممکن ہے فلسطینی فدائین جس مایوسی کا شکار ہو کر خودکش حملے کر رہے ہیں، وہ اسرائیلی فوج کے طرزِ عمل سے پیدا ہونے والی مایوسی ہو۔ساتھ ہی انہوں نے کہا ہے کہ اگر فلسطینیوں کو ایک اچھی زندگی گزارنے کے مواقع ملیں تو وہ ایسے حملے بند کر دیں گے۔اگر دیکھا جائے تو اسرائیل کے وزیر جنگ کا بیان بھی سی این این کے ڈپٹی سربراہ اور شیری بلیئر کے بیانات کی توثیق کر رہا ہے۔

اسی دوران امریکی صدر جونیئر بش کا فلسطینی ریاست کے قیام کا فارمولا سامنے آ گیا ہے



جس میں یاسر عرفات کو ہٹایا جانا ضروری قرار دیا گیا ہے۔اس فارمولا کے بارے میں کچھ کہنا اس لئے بیکار ہے کہ اسرائیل نے ابھی تک کون سے معاہدے کا پاس کیا ہے اور کون سے فارمولے کو صدق دل سے قبول کیا ہے۔پھر بھی جہاں تک جونیئر بش کی جانب سے یاسر عرفات کو ہٹانے کے فرمان کا تعلق ہے روس اور چین نے فوری طور پر اس کی مخالفت کی ہے اور اب تو امریکہ کے سب سے سرگرم اور قریبی حلیف برطانیہ نے بھی اس کی تائید کرنے سے انکار کر دیا ہے۔جرمنی، فرانس اور بعض دیگر یورپی ممالک میں پہلے ہی سے من مانے امریکی اقدامات کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا جا رہا ہے اور اب تو کینیڈا جیسے ملک نے بھی امریکہ کی ایسی پالیسیوں کے حوالے سے محتاط طرزِ عمل کا مظاہرہ شروع کر دیا ہے۔بے شک ایسی باتوں سے ابھی امریکی حکومت کی صحت پر کوئی خاص اثر پڑنے والا نہیں ہے۔لیکن عرب اور اسلامی بلاک میں امریکہ کی طرف سے عربوں اور مسلمانوں کی مسلسل تذلیل کئے جانے کا جو احساس مستحکم ہوتا جا رہا ہے اور امریکہ کے حلیفوں میں امریکی متشدد فیصلوں کے خلاف جو ردِعمل پیدا ہو رہا ہے اس سے ایک ہلکی سی امید کی جا سکتی ہے کہ شاید امریکہ سرکار خود ہی اپنی اداؤں پر غور کرے، اپنے طرزِ عمل میں تبدیلی لائے اور اپنے لئے ''ایک جارح عالمی طاقت'' کے بجائے ''ایک عظیم عالمی مملکت'' کہلانے میں عزت محسوس کرنے لگے۔مطلب دونوں کا ایک ہے مگر اس فرق کے ساتھ کہ اول الذکر سے ''بدی کا محور'' ہونے کی بو آتی ہے اور ثانی الذکر سے دنیا بھر کے لئے ''محبت کی خوشبو'' آتی ہے۔دنیا بھر کے ممالک امریکہ کے حکمرانوں سے ''محبت کی خوشبو'' کی توقع رکھتے ہیں، لیکن۔۔۔۔؟

اگر امریکی حکومت کسی عالمی ردِعمل کو خاطر میں نہیں لاتی اور ایسے ہی من مانی دھاندلی کئے جاتی ہے تو پھر ایسا امکان موجود ہے کہ تھوڑا آگے چل کر اسلامی ممالک سمیت بعض اہم ممالک اقوام متحدہ سے علیحدگی اختیار کر لیں اور اس عالمی ادارہ کا حشر بھی ادارہ اقوام عالم جیسا ہو جائے۔ایسا نہیں ہوتا اور بین الاقوامی ردِعمل کو بھی امریکہ مزید بڑھنے سے پہلے کسی طریقے سے روک لیتا ہے اور موجودہ جارحانہ اور غیر عادلانہ کردار سے بھی باز نہیں آتا تو پھر یہ امکان موجود ہے کہ اسرائیل، کشمیر، افغانستان اور دنیا جہان کے مظلوم خطوں کے نوجوان اور ان کے جائز مطالبات سے ہمدردی رکھنے والے اپنے دھماکوں اور خودکش حملوں کا سلسلہ اسرائیل، کشمیر اور اسی طرح کے خطوں سے بڑھا کر براہ راست امریکہ تک لے آئیں۔اگر امریکہ کے مختلف شہروں میں خودکش

حملے ہونے لگے تو پھر امریکہ ہی خودکش حملوں کا مرکز بن جائے گا اور اس کی سو فیصد ذمہ داری امریکی حکام کے پالیسی ساز اداروں کے طویل غیر منصفانہ طرزِ عمل پر عائد ہوگی۔

طاقت کا نشہ اپنی جگہ لیکن امریکی حکام اپنی ملٹی نیشنل کمپنیوں کے مفادات کے ساتھ اپنے سادہ دل اور سادہ لوح امریکی عوام کے مفادات کا بھی خیال کریں۔ ویسے میں تو چاہوں گا کہ امریکہ واقعی دنیا کا سب سے بڑا ملک بنے، سب سے بڑی طاقت بنے لیکن میں اس بڑائی کی بات کر رہا ہوں جو چھوٹوں پر دھونس جمانے والی نہیں بلکہ محبت نچھاور کرنے والی ہوتی ہے۔ امریکی حکام کو ابھی تک اس محبت کا ایک قطرہ بھی نصیب نہیں ہوا ہے۔

سعودی سفیر غازی القیتی کے جس بیان کا میں نے شروع میں ذکر کیا ہے۔ اس سے بظاہر ایسا لگتا ہے جیسے وہ فلسطینیوں کے لئے رحم کی بھیک مانگ رہے ہیں جبکہ زندگی بھیک میں نہیں ملتی۔۔۔۔ لیکن اگر غور کریں تو یہ ایک زبردست بیان ہے۔ مغربی ممالک میں جانوروں کے حقوق کے لئے کئی تنظیمیں بنی ہوئی ہیں اس لئے مغربی ممالک اس بیان کی اہمیت کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ غازی القیتی کا یہ کہنا کہ میں فلسطینیوں کے لئے انسانی حقوق کی نہیں بلکہ صرف ان حقوق کی درخواست کرتا ہوں جو جانوروں کو دیئے جاتے ہیں۔۔۔ رحم کی بھیک نہیں ہے بلکہ ان تمام ''مہذب ممالک'' کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ ہے جو براہِ راست یا بالواسطہ کسی نہ کسی رنگ میں اسرائیلی مظالم کی تائید کر رہے ہیں۔

یہ ایسا زوردار طمانچہ ہے جس کی گونج ان تمام مہذب ممالک کو اس وقت تک اپنے اندر سے سنائی دیتی رہے گی جب تک وہ خود فلسطینیوں کو ان کا جائز حق نہیں دلا دیتے۔ سعودی عرب کے شہزادہ عبداللہ کے بعد سعودی سفیر کے ایسے تیوروں سے مجھے عالمِ عرب اور عالمِ اسلام کے حالات بہتر ہونے کے سلسلے میں امید کی کرن سی محسوس ہونے لگی ہے۔

☆☆☆



# آیئے ہم سب مختاراں بی بی کے لئے روئیں!

میں نے اپنے گزشتہ کالم میں اشارہ دیا تھا کہ اگر امریکہ کی طرف سے من مانی کارروائیوں کا سلسلہ جاری رہا تو اقوام متحدہ کے ٹوٹنے کا خطرہ موجود ہے۔ اسی طرح اگر دنیا کے مختلف علاقوں میں بالواسطہ یا بلاواسطہ امریکی مظالم کا سلسلہ بند نہ ہوا تو وہ دن دور نہیں جب امریکہ کے شہروں میں دھماکے ہونا شروع ہو جائیں گے۔ اس سلسلے میں اسی ہفتہ کے دوران مستقبل کے چند اہم واقعات کی جھلکیاں سی سامنے آنے لگی ہیں۔ نیٹو، جس کا قیام سوویت یونین روس کے خلاف عمل میں لایا گیا تھا اور اب روس جس کا ممبر بن چکا ہے، اس نیٹو کے امریکہ سے شدید اختلاف پیدا ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ ''جنگی جرائم کی عالمی عدالت'' کے سمجھوتے پر امریکی حکام کا دستخط کرنے سے انکار نہ صرف امریکہ کو اپنے ہی حلیفوں سے دور کرنے کا باعث بنے گا بلکہ اس انکار سے امریکی صدر جونیئر بُش نے دراصل بالواسطہ طور پر اپنی ''بہادر'' افواج کے عالمی سطح پر جنگی جرائم کا اعتراف کر لیا ہے۔ اُدھر فلسطین کے مسئلہ پر امریکہ کے سب سے قریبی حلیف برطانیہ کے اختلافات مزید کھل کر سامنے آرہے ہیں۔ امریکی صدر پر ''اسرائیل کا سپوکس مین'' کی پھبتی کسی جا رہی ہے۔ اب ایک طرف ان مغربی ممالک میں تبدیلیوں کی ایک کلبلاہٹ سی محسوس ہونے لگی ہے دوسری طرف پاکستان سے علامہ اقبال کے صاحبزادے جسٹس جاوید اقبال کی طرف سے ''مسلم اقوام متحدہ'' کی تجویز سامنے آئی ہے اور اس پر بجا طور پر بعض دانشوروں نے ایسی نئی اقوام متحدہ کو مسلم دائرے تک محدود رکھنے کے بجائے اس میں چین اور بعض دیگر اہم ممالک کی شمولیت کا

مشورہ دیا ہے۔ گویا دنیا اب ایک نئی اقوام متحدہ کے بارے میں سوچنے لگی ہے۔ ایسی اقوام متحدہ جو امریکی ''انصاف'' سے پاک ہو۔

میں ان سارے حوالوں سے اس بار اطمینان سے اور تفصیل سے اظہار خیال کرنا چاہتا تھا لیکن پاکستان سے ایک ایسے سانحہ کی خبر آئی ہے کہ میری روح لرز اٹھی ہے۔ مجھے یہ سارا عالمی منظر بے معنی لگنے لگا ہے۔ خبر یہ ہے کہ پاکستان کے ضلع مظفر گڑھ کے شہر جتوئی کے ایک نواحی گاؤں موضع میر والا میں ایک ظلمِ عظیم ہو گیا ہے۔ اس ظلم، اس سفاکی اور جنسی بربریت کی روداد یہ ہے کہ موضع میر والا میں مستوئی قبیلہ کی جانب سے الزام لگایا گیا کہ عبدالشکور نامی ایک گیارہ سالہ لڑکے نے مستوئی قبیلے کی بڑی عمر کی سلمٰی نامی ایک عورت کے ساتھ جنسی زیادتی کی ہے۔ گیارہ سالہ بچے نے کسی عورت کے ساتھ کیا زیادتی کرنا تھی۔ اگر اس الزام میں کوئی صداقت ہے تو پھر بھی حقیقت اتنی ہی ہے کہ اس عورت نے اس بچے کو بہلا پھسلا کر اپنی خواہش پوری کرنا چاہی ہوگی۔ اس سے زیادہ کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ جبکہ وقوعہ صرف اتنا تھا کہ مستوئی قبیلے کی بڑی عمر کی عورت اس بچے کو ساتھ لے کر جا رہی تھی۔ اس کے نتیجہ میں گاؤں میں پنچایت بلائی گئی اور عبدالشکور کے والد کو کہا گیا کہ وہ اپنی اٹھارہ سالہ بیٹی کو بھی ساتھ لے کر آئے۔ پنچایت کے وقت گاؤں کے ایک ہزار کے لگ بھگ افراد جمع تھے۔ اس بھری پنچایت نے فیصلہ سنایا کہ گیارہ سالہ عبدالشکور نے مستوئی قبیلے کی عزت تاراج کی ہے اس کے بدلہ میں اس کی بہن مختاراں بی بی جو حافظ قرآن بھی ہے، اس کے ساتھ مستوئی قبیلہ کے چار افراد جنسی فعل کریں گے۔ چنانچہ چار خبیث فطرت افراد عبدالخالق، اللہ دتہ، فیاض اور غلام فرید نے نہ صرف اس معصوم اور بے قصور بچی کے ساتھ جنسی ظلم کیا بلکہ اس کے بعد اسے کہا گیا کہ وہ اپنے گھر تک بالکل برہنہ حالت میں پیدل چل کر جائے اور ایسا ہی کرایا گیا۔ فیصلہ کرنے والی پنچایت کا ایک رکن خود بھی جنسی ظلم کرنے والے چار افراد میں شامل ہوا۔ اس ''کھلی حرامزدگی'' کے ارتکاب کے وقت گاؤں کا ایک ہزار کا مجمع موجود تھا اور ان میں سے کسی نے غیرت کا مظاہرہ تو کیا اتنی اخلاقی جرات کا مظاہرہ بھی نہیں کیا کہ اس فیصلے کو غلط قرار دے دیتا یا کسی رنگ میں غیر موثر مزاحمت ہی کر دیتا۔

اس ظلم کے ساتھ مزید ظلم یہ ہوا کہ عبدالشکور کے ساتھ بھی بدفعلی کی گئی، اسے وحشیانہ تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور پھر ہماری مستعد اور فرض شناس پولیس نے گیارہ سالہ بچے کو حوالات میں بند



کر دیا۔ بچے کے ورثاء سے مطالبہ کیا گیا کہ گیارہ ہزار روپے رشوت دے کر لڑکا چھڑا لے جاؤ۔

یہ سانحہ ۲۲/جون ۲۰۰۲ء کو ہوا اور ۳۰/جون تک کسی قانونی کاروائی کی کوئی صورت نہیں بنی۔ یونین کونسل کے ناظم سے لے کر پولیس تک سب چین ہی چین لکھ رہے تھے اور پورے گاؤں کے سامنے ہونے والا اتنا سفاک جنسی جرم ہو جانے کے باوجود مظلوموں کی حق رسی کی کوئی صورت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

۳۰/جون کو اس سانحہ کی خبر میڈیا تک پہنچی، اس میں جتوئی شہر اور ارد گرد کے بعض وکلاء نے موثر کردار ادا کیا۔ جیسے ہی خبر اخبارات اور ٹی وی تک پہنچی سرکاری ادارے حرکت میں آ گئے۔ محمد اسلم، اللہ دتہ، خلیل احمد، محمد قاسم، غلام حسین، حضور بخش، رسول بخش، نذر حسین آٹھ افراد کو فوری طور پر گرفتار کر لیا گیا جن کے بارے میں بتایا گیا کہ ان کے اصرار پر ایسا خبیث فیصلہ سنایا گیا اور اس پر عمل کرایا گیا۔ بعد میں اس ظلم اور حرامزدگی کا ارتکاب کرنے والے چاروں خبیث افراد عبدالخالق، اللہ دتہ، فیاض اور غلام فرید کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ حکومت نے موثر طور پر کاروائی کرنے کا عندیہ دیا ہے۔ جبکہ پاکستان کی سپریم کورٹ نے از خود اس واقعہ کا نوٹس لیتے ہوئے اس علاقہ کے پولیس حکام کو عدالت میں طلب کر لیا ہے۔

یہ کوئی ایک واقعہ نہیں ہے جو پاکستان میں ہوا ہے۔ خواتین کو ننگا کر کے سر بازار چلنے پر مجبور کرنے کے واقعات پہلے بھی ہو چکے ہیں۔ خاص طور پر ہماری سرائیکی بیلٹ ملتان، ڈیرہ غازی خان اور بھاولپور کے علاقوں میں اور سندھ کے دیہی علاقوں میں ظلم اور بربریت کے ایسے شرمناک سانحے وقتاً فوقتاً ہوتے رہتے ہیں اور اتنی مہارت کے ساتھ ہوتے ہیں کہ ان کی خبر تک باہر نہیں جانے دی جاتی۔ ڈیرہ غازی خاں ڈویژن کے ضلع مظفر گڑھ میں یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں ہوا۔ شاید اسی لئے ہمارے بابائے جمہوریت نوابزادہ نصر اللہ خان سے لے کر سابق صدر سردار فاروق لغاری تک ان علاقوں سے تعلق رکھنے والے سیاستدانوں کو قوم کے درد سے اور جمہوریت کی فکر سے فرصت ہی نہیں مل سکی۔ اگر میں یہ کہوں کہ ملک کی تقدیر بدلنے پر تلے ہوئے دونوں سیاست دانوں نے اگر اپنے علاقے کے لوگوں کو انسانیت کا تھوڑا سا درس بھی دے دیا ہوتا تو انسانیت کے منہ پر اتنی کالک سر عام نہ ملی جاتی۔

میں اس سانحہ کے بارے میں جاننے کے بعد خون کے آنسو رویا ہوں۔ یہ ظلم ایک ایسی

مسلمان اور حافظ قرآن بچی کے ساتھ ہوا ہے جو بالکل بے قصور اور معصوم تھی۔کسی بھی جھوٹے سچے الزام سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔اور یہ حرکت کرنے والے نہ ہندوستان کے جنونی اور انتہا پسند ہندو تھے اور نہ ہی جنگی جرائم کے مرتکب کوئی امریکی یا اسرائیلی فوجی تھے۔یہ ظلم کرنے والے، یہ قیامت ڈھانے والے اسی گاؤں کے مسلمان تھے۔

اگر ہم اپنے محدود عدالتی (پنچایت) دائرے میں اتنے ظالم اور بے انصاف ہیں، اگر ہماری پولیس کا کردار اتنا گھناؤنا ہے، اگر ہماری لوکل حکومت یعنی یونین کونسل کے ممبران اور اس کے ناظم کی بے حسی اس حد تک چلی جاتی ہے جہاں انسانیت نام کی کوئی چیز نہیں ملتی، اور اگر ایک ہزار کے مجمع میں ایک آواز، نحیف سی آواز بھی احتجاج کے لئے نہیں اٹھتی (جس سے ہماری اجتماعی بے حسّی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے)، تو پھر وہ اقوام جو ہماری دشمن بنی ہوئی ہیں ان سب کو حق حاصل ہے کہ ہمارے ساتھ جو کچھ کر رہی ہیں ٹھیک کر رہی ہیں۔جب ہم خود اپنے دائروں میں ہر طرح کا ظلم اور بدمعاشی کرنا جائز سمجھتے ہیں اور اسے اپنا انصاف قرار دیتے ہیں تو پھر غیر اقوام اپنے نکتۂ نظر سے ہمارے ساتھ جو کچھ کر رہی ہیں وہ اپنے تمام اقدامات میں حق بجانب ہیں۔

میں اس وقت پریشان ہوں کہ فلسطین، کشمیر، عراق اور افغانستان کے مظلوموں کے لئے کچھ لکھوں یا پاکستان کی بیٹی، مختاراں بی بی کے ساتھ ہونے والے ظلم کا ماتم کروں۔یقین کیجئے اس ایک لمحے میں میرے سامنے وہ سارے مظالم چھوٹے ہو گئے ہیں جو فلسطین، کشمیر، عراق اور افغانستان پر ایک منظّم سازش کے تحت ڈھائے جا رہے ہیں کیونکہ ان مظالم کو ڈھانے والے دشمن ہیں اور ان سب کے مقابلہ میں مختاراں بی بی کے ساتھ اپنے ہی مسلمانوں کے ہاتھوں روا رکھے جانے والا ظلم بہت بڑا ہو گیا ہے۔

مجھے ایسے لگا ہے جیسے مختاراں بی بی ہی فلسطین اور عراق ہے، اور مختاراں بی بی ہی کشمیر اور افغانستان ہے۔۔۔امریکہ اور اس کے سارے حلیفوں نے، اسرائیل اور ہندوستان نے۔۔۔سب نے مل کر چاروں اطراف سے مختاراں بی بی پر حملہ کر دیا ہے۔فلسطین، عراق، کشمیر، افغانستان سب لٹ گئے ہیں۔۔۔مختاراں بی بی لٹ گئی ہے۔

آیئے ہم سب مل کر مختاراں بی بی کے لئے روئیں!

☆☆☆



# انڈو پاک، مسائل اور مستقبل

پاکستان اور انڈیا کے عوام کے مسائل اور دکھ بالکل ایک جیسے ہیں۔دونوں ممالک کے عوام کی بہت بڑی اکثریت کا مسئلہ تعلیم کا حصول، اچھا علاج معالجہ، غربت کا خاتمہ اور دیگر بنیادی انسانی ضروریات ہیں۔اسے مختصر لفظوں میں کہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ برصغیر کے عوام کو غربت، بھوک، بیماریوں اور جہالت سے جنگ کرنا ہے اور ان ساری مصیبتوں سے نجات پانا ہے۔برصغیر کے عوام کی بدقسمتی یہ رہی ہے کہ اس کے ممالک کے حکمرانوں نے اصل مسائل کی طرف بہت کم توجہ دی ہے اور اپنے اپنے اقتدار کو طول دینے کے لئے غیر ضروری اور غیر متعلق مسائل کو زیادہ ہوا دی ہے۔سیاسی پارٹیوں کی اکھاڑ پچھاڑ اور مار دھاڑ سے لے کر قومی خزانے میں کرپشن اور لوٹ مار کا ایک سلسلہ ہم دونوں ممالک میں دیکھتے ہیں۔اس معاملہ میں نعروں کے فرق کے باوجود دونوں اطراف کے ''اشرافیہ'' نے ہر سطح پر اور ہر ممکن رستے سے اپنے اپنے ملک میں مالی کرپشن کا ''نیک کام'' کیا ہے۔اس کے نتیجہ میں لٹیرے ''اشرافیہ'' میں مختلف طبقات کا اضافہ ہوتا گیا اور غریب عوام غریب سے غریب تر ہوتے گئے۔اسی غربت نے مزید مسائل کو جنم دیا۔احساسِ محرومی نے معاشرے میں بغاوت کی مختلف صورتوں میں جرائم کے نئے رستے بنائے۔یوں ہمارے غربت زدہ معاشرے مزید کئی سماجی دکھوں میں مبتلا ہوتے گئے۔

برصغیر کے ''اشرافیہ'' نے ایک طرف اقتدار کے مزے لوٹے، عوام کا استحصال کیا، اپنے گھروں میں دولت کے انبار لگا کر غریب عوام کی پھیلی ہوئی جھولیوں میں مزید غربت بھرتے

گئے۔تو دوسری طرف اسی ''اشرافیہ'' نے اپنے اقتدار کے استحکام کے لئے وقتاً فوقتاً مختلف حربے استعمال کر کے غریب عوام کے مختلف طبقوں کو آپس میں لڑانے کا سلسلہ جاری رکھا تا کہ انہیں اپنے اصل مسائل کی طرف دھیان دینے کا موقعہ نہ ملے۔ وہ مختلف سیاسی اور مذہبی نعروں کے چکر میں پڑ کر ایک دوسرے سے الجھتے رہیں۔ایک دوسرے کا خون بہاتے رہیں۔اور ''اشرافیہ'' طبقہ اطمینان سے اپنی لوٹ مار میں مشغول رہے۔

انڈیا میں ایک وقت تک فرقہ پرست قوتیں موجود ہونے کے باوجود اتنی طاقتور نہ تھیں جتنی اس وقت ہیں۔ پاکستان میں ایک عرصہ تک فرقہ پرست قوتوں کو کوئی اہمیت نہیں مل سکی تھی۔ جنرل ضیاءالحق کے زمانہ میں جب انہوں نے مختلف طبقات کو آپس میں لڑانے کے ساتھ مذہبی فرقہ پرستی کو بھی ہوا دی تب ہی اس کے اثرات انڈیا کے انتہا پسند ہندو طبقوں پر مرتب ہونے لگے۔ پاکستان میں تو فرقہ پرستی ایک تکلیف دہ صورت اختیار کر گئی۔مسجدوں اور امام باڑوں کی جتنی بے حرمتی اس کے نتیجہ میں ہوئی ہے،سب کے سامنے ہے۔ پھر پاکستان کی اقلیتوں کو بھی عدم تحفظ اور نفرت کا ایک نفسیاتی خوف لاحق رہا اور اس کی وجہ بھی جنرل ضیاءالحق کا لایا ہوا فرقہ پرستی پھیلانے والا اسلام ہی تھا۔اس ''جرنیلی اسلام'' کے نتیجہ میں ایک طرف اندرون ملک مذہبی تشدد کا خونریز سلسلہ چل نکلا۔دوسری طرف ہندوستان کی انتہا پسند ہندو جماعتوں میں ''ہندوتوا'' کی لہر توانا ہوتی گئی اور اسی کا نتیجہ ہے کہ اب انڈیا کا اقتدار انہیں انتہا پسند قوتوں کے ہاتھ میں ہے۔اور ان کی سرپرستی میں گجرات میں مسلمانوں کے خلاف ہونے والے شرمناک فسادات کا زخم تو ابھی بالکل تازہ ہے۔انڈیا اور پاکستان،دونوں طرف کے مذہبی انتہا پسندوں کی وجہ سے دونوں ممالک کے درمیان مذہبی نفرت کی خلیج گہری ہوتی جا رہی ہے۔اس کا فائدہ انتہا پسند ہندو جماعتوں اور انتہا پسند مسلم جماعتوں کو ہو رہا ہے لیکن عوام کے دکھوں میں کوئی کمی ہونے کے بجائے اس میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ کیونکہ نفرت کا یہ زہر تو مختلف خطرناک نشہ آور انجکشنز کی طرح عوام ہی کو انجیکٹ کیا جا رہا ہے۔اور اس کا سارا عذاب دونوں طرف کے عوام ہی کو بھگتنا ہے۔

سیاسی سطح پر کشمیر کا مسئلہ بلاشبہ پاکستان اور انڈیا کے درمیان بے حد حساس اور سنگین مسئلہ ہے۔اگر انصاف اور نیک نیتی کے ساتھ مسئلہ حل کرنا ہو تو اقوام متحدہ کی قرارداد کے مطابق اور کشمیری عوام کی مرضی کے مطابق فیصلہ کیا جا سکتا ہے اور یہی ایماندارانہ اور منصفانہ حل ہے



جو کشمیریوں کا جائز حق بنتا ہے۔لیکن گزشتہ نصف صدی سے زائد عرصہ سے کشمیری عوام نہ صرف اپنے حق رائے دہی سے محروم ہیں بلکہ ان پر بے پناہ ریاستی ظلم بھی توڑے گئے ہیں۔ دونوں ممالک کی ''اشرافیہ'' قوتیں اس مسئلہ کے حل سے زیادہ اس کا نام لے کر غریب عوام کو مروانے اور ان کے نام پر اپنی سیاست چمکانے میں زیادہ دلچسپی لیتی رہی ہیں۔

ایسے حالات میں جب پاکستان اور ہندوستان کے تعلقات کشیدگی کی انتہا تک پہنچ گئے ہیں۔یہاں مجھے ماضی کی ایک اہم بات یاد آ گئی۔اگر ہمارے ایک جنرل نے ملک کو نفرت کی آماجگاہ بنایا تھا جس کے اثرات انڈیا پر بھی پڑے تو ہمارے ہی ایک جنرل صدر ایوب خان نے ایک زمانے میں جواہر لال نہرو کو دوستی کی ایک ایسی پیش کش کی تھی جس کے نتیجہ میں انڈو پاک کی ایک طرح سے ڈھیلی ڈھالی کنفیڈریشن وجود میں آ سکتی تھی۔اس کے نتیجہ میں دونوں ممالک اپنی افواج میں بہت زیادہ کمی کر کے اپنے ملک کے غریب عوام کے حالات کو بہتر بنا سکتے تھے۔افسوس کہ نیک نیتی کے ساتھ کی جانے والی صدر ایوب خان کی ایک بہت اچھی پیش کش کو جواہر لال نہرو جیسے زیرک سیاستدان نے رد کر کے اپنی سیاسی بے بصیرتی کا ثبوت دیا۔اگر صدر ایوب خان کی اُس پیش کش کو خلوص دل سے قبول کر لیا گیا ہوتا تو آج برصغیر کے غریب عوام بہت خوشحال نہ سہی لیکن اچھی زندگی بسر کر رہے ہوتے۔

اب جو ایل کے ایڈوانی اور ان کے بعض ہمنوا گاہے بگاہے ''اکھنڈ بھارت'' کی بات کرتے ہیں،ان کی دھونس جمانے والی زبان کے باعث کشیدگی میں اضافہ ہو جاتا ہے لیکن ان کا خواب اس انداز سے کبھی پورا نہیں ہو سکتا۔اگر ایل کے ایڈوانی نیک نیت کے ساتھ اور بھائیوں والی زبان میں صدر ایوب والی پیش کش کو اس بار اپنی طرف سے دہراتے تو اس سے نہ صرف کشمیر کا مسئلہ بھی باعزت طور پر اور برادرانہ طور پر حل ہو جاتا بلکہ انڈیا اور پاکستان کے بہت سارے مشترکہ مسائل کا مشترکہ حل تلاش کرنے میں مدد مل سکتی۔

میرے ذہن میں یورپی یونین کی طرز پر سارے سارک ممالک کے درمیان اشتراک کا منظر ایک خواب کی طرح آتا ہے۔ یورپ نے ایک عرصہ تک شدید نفرتوں کا بازار گرم کئے رکھا۔کئی باہمی لڑائیوں کے ساتھ دو عالمی جنگیں بھی ہو گئیں۔اتنا لڑنے مرنے کے بعد آخر سب کو جو بات سمجھ میں آئی اس کے نتیجہ میں یورپی یونین کا اتفاق اور اتحاد قائم ہو چکا ہے۔اب صورتحال یہ ہے

که کسی ملک کی سرحدوں کی سلامتی کو کسی سے کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے۔ کسی ملک کی سرحدوں کے کسی حصہ پر کسی کا کوئی غاصبانہ قبضہ نہیں ہے۔ کسی کی طرف سے کوئی ایسا دعویٰ نہیں ہے۔ ہر ملک اپنی مکمل خودمختاری اور سلامتی کے ساتھ قائم ہے۔ اس کے باوجود حالت یہ ہے کہ ایک ملک سے دوسرے ملک میں داخل ہوتے وقت یہی پتہ نہیں چلتا کہ ہم اب دوسرے ملک میں آ گئے ہیں۔

میرے نزدیک اس وقت انڈو پاک کا خاص طور پر اور سارے سارک ممالک کا عمومی طور پر اتحاد ہو جانا اس خطے کے لئے بابرکت ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے کشمیر کے مسئلے کو منصفانہ طور پر حل کیا جائے، پھر ''اکھنڈ بھارت'' کی بڑکیں مارنے کے بجائے دوستانہ طور پر اور نیک نیت کے ساتھ پورے خطے میں پیار اور محبت کو فروغ دیتے ہوئے اتحاد کا کام شروع کیا جائے۔ انڈو پاک کے درمیان اعتماد کی بحالی اور جملہ نفرتوں کے خاتمہ کے لئے دونوں اطراف سے موثر اقدامات کئے جائیں تو سارک ممالک کا اتحاد محض خواب نہیں ایک حقیقت بن سکتا ہے۔ ایسی حقیقت جس سے اس خطے کے غریب عوام کی قسمت بدل سکتی ہے۔ لیکن اگر انڈیا اور پاکستان کے درمیان کشیدگی برقرار رہی اور فرقہ پرست قوتیں اپنی انانیت کا شکار رہیں تو پھر ان ممالک کو یورپی ممالک کی طرح زیادہ سوچنے کی مہلت نہیں ملے گی۔ اگر ان کی اگلی جنگ ہوئی تو پھر دونوں ممالک کی مکمل تباہی کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔ کیونکہ دونوں ممالک ہی ایٹمی قوت رکھتے ہیں۔ لیکن یہ کیسی نفرت ہوگی جو دونوں ممالک کی تباہی کے بعد گواہی دے گی کہ انڈیا اور پاکستان کا جینا، مرنا ساتھ ساتھ تھا۔ محبت کے ایسے مقام پر ہوتے ہوئے دونوں ملک نفرت کی ایٹمی آگ میں جل گئے۔ بہتر ہوگا کہ ایسے وقت کے آنے سے پہلے ہی حقائق کا ادراک کر لیا جائے۔ اسی میں ہم سب کی، اس خطے کے تمام عوام کی بہتری اور بھلائی ہے۔

☆☆☆



# جنرل پرویز مشرف اور پاکستان

میں جنرل پرویز مشرف کے مداحوں میں سے ہوں۔ جن حالات میں ان کو ملک کا اقتدار سنبھالنا پڑا اور پھر شروع میں انہوں نے جس بے لاگ انداز اور صاف گوئی کے ساتھ قوم کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا عام پاکستانیوں کی طرح مجھے بھی ان کا انداز بہت اچھا لگا تھا۔ وطنِ عزیز اور اس کے غریب عوام کی بھلائی کے لئے میں نے ان سے بہت سی توقعات وابستہ کر لی تھیں۔ مجھے افسوس ہے کہ جنرل پرویز مشرف نہ صرف اپنا وہ صاف صاف بات کرنا بھولتے جا رہے ہیں بلکہ اپنی اولین ترجیحات سے بھی کافی پرے ہٹ گئے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء کے بعد پاکستان پر ایک نئی افتاد آن پڑی تھی۔ جنرل پرویز مشرف نے کچھ اپنے لچکیلے رویے کے باعث اور کچھ عالمی منظر سے پیدا ہونے والی پاکستان کی مجبوریوں کے باعث ممکنہ حد تک قوم کو زیادہ بڑے نقصان سے بچانے کی کوشش کی ہے اور اس کوشش میں لڑکھڑاتے ہوئے سہی وہ ابھی تک معاملہ سنبھالے ہوئے ہیں۔ عالمی افتاد کے باوجود جنرل پرویز مشرف عام انتخابات کرانے جا رہے ہیں۔ یہ بہت اچھی بات ہے لیکن ان کے کرنے کا جو سب سے اہم اور سب سے زیادہ ضروری کام تھا وہ چند دنوں کی گہما گہمی کے بعد جیسے بھلا دیا گیا ہے۔

سول حکومت۔۔۔فوج کی مداخلت۔۔۔انتخابات۔۔۔اور پھر سول حکومت سے فوجی حکومت تک میوزیکل چیئر کا جو کھیل گزشتہ ۵۵ برس سے جاری تھا، میرے نزدیک جنرل پرویز

مشرف اس میوزیکل چیئر گیم سے بالکل الگ تھے۔لیکن اب ''جو کچھ ہونے جا رہا ہے'' اور'' جو بالکل نہیں ہو رہا ہے'' اس سے ان کی حکومت بھی سابقہ کھیل کا ایک تسلسل بن کر رہ گئی ہے۔جو کچھ ہونے جا رہا ہے وہ تو وہی کچھ ہے جو اس سے پہلے بھی بار ہا ہو چکا ہے۔لیکن ''جو نہیں ہو رہا'' میرے نزدیک وہی اس قوم کا سب سے بڑا اور اہم مسئلہ ہے۔اس ملک کو''اشرافیہ'' کے ہر طبقہ نے بے دردی سے لوٹا ہے۔اس میں سیاستدانوں کی تخصیص نہیں ہے۔سیاستدان، بیوروکریسی،فوج کے اعلیٰ حکام سب نے حسب توفیق اس ملک کو لوٹا ہے۔ملک پر بین الاقوامی قرضوں کا ہولناک بوجھ اسی لوٹ مار کا نتیجہ ہے۔

ڈاکٹر رشید امجد اردو کے معروف جدید افسانہ نگار ہیں۔حال ہی میں ان کی یادوں کی کتاب ''تمنا بے تاب'' شائع ہوئی ہے۔اس میں سے ایک واقعہ یہاں درج کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔اسے کسی افسانہ نگار کا افسانہ نہیں سمجھیں ، یہ پاکستان میں ہونے والی لوٹ مار کی المناک صورتحال کی نشاندہی کرنے والا ایک سچا واقعہ ہے۔ڈاکٹر رشید امجد لکھتے ہیں:

''گزشتہ دنوں میں ذکریا یونیورسٹی ملتان میں گیا تو ایک شام ملک ظفر نے ایک حیرت انگیز بلکہ ناقابلِ یقین واقعہ سنایا۔انہوں نے بتایا کہ پنجاب کے ایک گورنر کو جو صاحبان عالیشان میں سے تھا، بہاولپور کے علاقہ میں مربعے الاٹ ہوئے۔ایک دن گورنر نے کمشنر بہاولپور سے فون پر پوچھا کہ ان مربعوں کی مالیت کیا ہوگی؟

کمشنر نے یونہی نمبر بنانے کے لئے کہہ دیا ''سر! تقریباً ایک کروڑ''

گورنر نے کہا ''تو ایک ہفتہ میں مربعے بیچ کر کروڑ روپے انہیں بھجوا دیئے جائیں۔''

کمشنر کو مصیبت پڑ گئی۔وہ تو اس نے یونہی نمبر بنانے کے لئے کہہ دیا تھا۔حقیقت یہ تھی کہ مربعے چند لاکھ سے زیادہ کے نہ تھے۔انہوں نے اپنے ماتحتوں کو بلایا کہ اب کیا کریں؟۔میٹنگ میں ایک ایس پی بھی تھے۔انہوں نے کہا ''سر! آپ اجازت دیں تو میں ایک راستہ بتاتا ہوں۔''۔۔۔۔۔۔۔۔۔کمشنر نے کہا ''وہ کیا؟''

اس نے کہا ''مقامی نیشنل بنک کی شاخ میں تین چار کروڑ ہمیشہ موجود ہوتے ہیں۔آپ اجازت دیں تو آج رات اس پر ڈاکہ پڑوا دیتے ہیں''

رات کو بنک پر ڈاکا پڑا اور دو کروڑ لوٹے گئے۔ایک کروڑ تو گورنر کو بھیج دیئے گئے اور ایک کروڑ



متعلقہ انتظامیہ میں بٹ گئے۔صبح چوری کا پرچہ درج ہو گیا۔کچھ عرصہ ذکر اذکار رہا پھر داخل دفتر۔''

اس ڈاکے کی حقیقت سے قوم کے اصل لٹیروں اور ڈاکوؤں کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔اگر اس ڈاکے سے فائدہ اٹھانے والے لوگوں کو طبقاتی طور بانٹیں تو گورنر صاحب سیاست دان،کمشنر صاحب بیوروکریٹ اور ایس پی صاحب پولیس کے محکمہ سے۔ان طبقوں میں مزید کئی طبقے شامل ہو چکے ہیں۔عدلیہ اور فوج بھی اس قومی لوٹ مار سے پاک نہیں رہ سکی۔اس ملک کو اس کے رہنماؤں اور محافظوں نے ہی لوٹا ہے اور جی بھر کر لوٹا ہے۔ظلم کی انتہا تو یہ ہے کہ اربوں کھربوں کے قرض لے کر معاف کرا لئے گئے ہیں اور آج تک ان لٹیروں کے ناموں کی مکمل فہرست تک اخبارات میں شائع نہیں ہو سکی۔

جب جنرل پرویز مشرف نے لوٹی ہوئی دولت وصول کرنے کے عزم کا اظہار کیا تھا تو مجھے پورا یقین تھا کہ صرف اسی دولت سے ہی پاکستان کے سارے قرضے اتر جائیں گے۔شروع میں جب بحری فوج کے ایک اعلیٰ افسر کو امریکہ سے گھسیٹ کر پاکستان لایا گیا تو توقع تھی کہ اور بہت سارے سابق فوجی افسران بھی اب لپیٹ میں آئیں گے لیکن لگتا ہے پاک فوج میں صرف اسی ایک افسر نے ہی ملک کو لوٹا تھا۔باقی سب گنگا نہائے ہوئے ہیں۔پھر سیاستدانوں کے احتساب میں پرنالہ پی پی پی کی قیادت سے بڑھا تو نواز شریف فیملی پر جا کر وہیں کا ہو رہا اور پھر ان کو بھی ملک سے باہر بھیج دیا گیا۔اللہ اللہ خیر صلا!

صرف بے نظیر اور نواز شریف کی شخصیات کی لوٹ مار اور بدعنوانیوں پر حکومت کی سوئی اٹک گئی۔نواز شریف کے دور میں ان کے دست و بازو بنے رہنے والے اور اسی بنیاد پر ملک کو دونوں ہاتھوں سے لوٹنے والے جو سیاستدان مسلم لیگ ق میں چلے گئے وہ سب پاک پوتر ہو گئے۔ان سے کسی حساب کتاب کی بات ہی نہیں کی گئی۔بیوروکریسی میں بھی احتساب کا انداز ایسا ہی رہا۔اور اب قوم کو بتا دیا گیا ہے کہ ملک کو لوٹنے والے سزا بھگتنے کے لئے تیار ہیں لیکن دولت واپس کرنے کو تیار نہیں ہیں۔اگر جنرل پرویز مشرف اس ملک کی لوٹی ہوئی دولت واپس نہیں لا سکتے اور ملک کو کھا جانے والوں پر بلا امتیاز اور بلا تخصیص شدید گرفت نہیں کر سکتے تو صاحب پھر وہ بھی جنرل ایوب، جنرل یحییٰ خان اور جنرل ضیا کا تسلسل ہیں۔پھر اپنی بلا سے بُوم بسے یا ہُما رہے۔

لیکن مجھے ابھی پوری مایوسی نہیں ہوئی۔مجھے ایسے لگتا ہے کہ بین الاقوامی یا یوں کہہ لیں کہ مغربی

فریب کاریوں سے نمٹتے نمٹتے انہیں اتنے داؤ پیچ کھیلنے پڑ رہے ہیں کہ اس کے نتیجہ میں وہ کئی نئے سے نئے مسائل میں الجھتے جا رہے ہیں۔تاہم اندرون ملک کے حوالے سے میں ایک بار جنرل پرویز مشرف کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ وہ اس ملک سے قرضے لے کر معاف کرا لینے والوں سے،قرضے لے کر واپس نہ کرنے والوں سے اور ہر طرح کے مہذب ڈاکوؤں سے نہ صرف قوم کی لوٹی ہوئی ایک ایک پائی وصول کریں بلکہ وصولی کے بعد انہیں عبرت ناک سزائیں دیں۔ایسا کرنے کے لئے وہ مکمل مارشل لا لگالیں تو قوم اس کو بھی برداشت کر لے گی۔ اگر وہ لوگ ادائیگیاں نہیں کرتے تو ان کی ساری جائیدادیں ضبط کریں اور انہیں مارشل لا کے تحت سخت ترین سزائیں دیں۔ایسی سخت قید و بند کہ اپنے چھپائے ہوئے سارے اثاثے خود ہی ظاہر کر دیں۔اگر آپ ایسا کرنے پر تل جائیں اور ملک کی لوٹی ہوئی ایک ایک پائی واپس لے آئیں تو پاکستان کے تمام مالی مسائل حل ہونے کے ساتھ ملک کی دولت لوٹنے کا کھیل رک سکتا ہے۔ایسی صورتحال میں لٹیرے طبقوں کو چھوڑ کر قوم کا ہر فرد آپ کے ساتھ ہوگا۔لیکن اگر آپ ایسا نہیں کرتے یا وصولیاں کرنے میں آپ کے لئے سو عذر ہو گئے ہیں تو پھر ایک بات جان لیجئے۔۔۔۔’’اشرافیہ‘‘ کی لوٹ مار تو گزشتہ ۵۵ برسوں سے جاری ہے اب غریب تر اور بھوکے ،ننگے پاکستانیوں کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا کہ وہ راہ چلتوں کو لوٹنا شروع کر دیں۔ گو اس وقت بھی ایسا ہونے لگا ہے تاہم ابھی ایسا بہت ہی کم تر سطح پر ہو رہا ہے لیکن جب اس ملک کے امیر اپنے مہذب ڈاکوں سے امیر ترین ہوتے جا رہے ہیں اور عام غریب پاکستانی غریب سے غریب ترین ہوتے جا رہے ہیں اور ان کا کوئی پرسان حال نہیں تو پھر ایسے غربا کا چھوٹے موٹے جرائم کی بجائے ڈاکے ڈالنا شروع کر دینا ممکن ہوسکتا ہے۔بہتر ہوگا کہ اتنے برے وقت کے آنے سے پہلے اصل بیماری کا علاج کر لیا جائے۔

اگر آپ اس طرف بے حد خصوصی توجہ نہیں کرتے اور اسے اپنی اولین ترجیح نہیں بناتے تو پھر آپ بھی اسی سابقہ فوجی دخل اندازی کا تسلسل ہیں جسے قوم ۵۵ برس میں نصف سے زائد عرصہ تک بھگت چکی ہے۔اور آپ کے تعمیر نو بیورو اور اسی طرز کے سارے کام صرف لٹی پٹی قوم کو مزید لوٹنے کا ایک کھیل ہیں اور کچھ نہیں۔

☆☆☆



# انتہائی خطرے کی گھنٹی

کیا دنیا اب اپنے انتہائی خطرناک ترین مرحلے میں داخل ہونے والی ہے اور اس انتہائی خطرے کی گھنٹی بجائی جا چکی ہے؟

مجھے کچھ ایسا لگ رہا ہے۔میرے خدشے کی بنیاد یہ ہے کہ حال ہی میں ’’واشنگٹن پوسٹ‘‘ نے ایک رپورٹ شائع کی ہے۔یہ رپورٹ ایک تھنک ٹینک کی سفارش ہے جو امریکی محکمہ دفاع پینٹا گون کو کی گئی ہے اور محکمہ دفاع پینٹا گون کے ذریعے امریکہ کے صدر کو بھیجی جائے گی۔وہاں بھیجی جا چکی ہے یا نہیں اور بھیجنے کی ضرورت ہے یا نہیں اس کی اب اتنی اہمیت نہیں جتنی اہمیت اس بات کی ہے کہ پریس کے ذریعے اس رپورٹ کو متعلقہ حلقوں تک پہنچا دیا گیا ہے پہلے اس رپورٹ کا یہ حصہ دیکھ لیں:

’’سعودی عرب بدی کا محور ہے۔وہ مالی مدد سے لے کر نظریہ سازی تک دہشت گردوں کی مدد کر رہا ہے۔امریکہ کو چاہئے کہ وہ سعودی عرب کی حکومت کو نوٹس دے کہ وہ ہر طرح کی دہشت گردی سے ہاتھ کھینچ لے ورنہ اس کے آئل فیلڈز اور اثاثے منجمد کر دیئے جائیں‘‘

ابھی تک ایران،عراق،لیبیا اور شمالی کوریا کو بدی کا محور قرار دیا گیا تھا۔سعودی عرب ہمیشہ سے امریکہ کا نیاز مند رہا ہے۔لیکن حالیہ دنوں میں اس کی طرف سے چند ایسے اقدامات کا اشارا دیا گیا ہے جو امریکہ کی بنیادی پالیسی سے میل نہیں کھاتے۔ان میں سے دو بہت ہی اہم ہیں۔ایک

عراق پر متوقع امریکی حملہ کی واضح طور پر مخالفت اور دوسرا فلسطینیوں کے بہیمانہ قتل عام پر اسرائیلی رویے کی مذمت کے ساتھ امریکہ ہی کو اس کا ذمہ دار قرار دینا۔ان معاملات میں اگر چہ دوسرے سعودی حلقے بھی اب کھل کر بات کرنے لگے ہیں تاہم یہ حقیقت ہے کہ شہزادہ عبداللہ کی جرأت مندی کے بعد باقی سب کو حوصلہ ملنے لگا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔''واشنگٹن پوسٹ'' کی رپورٹ کے بعد فوری طور پر امریکی وزیر دفاع سے لے کر دوسرے اعلیٰ حکام تک نے صورتحال پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔لیکن یہ سب ان کا ڈپلومیٹک انداز ہے۔اصل پیغام جو اس خبر کی صورت میں دینا تھا وہ دیا جا چکا ہے۔اس پیغام کے دو مقصد ہیں۔ایک کا تعلق مستقبل (بے حد) قریب سے ہے۔وہ پیغام یہ ہے کہ عراق پر حملہ کے سلسلے میں ہماری حمایت کرو۔اس وقت امریکی حکومت عالمی سطح پر اپنے جارحانہ طرز عمل سے مسلسل رسوا ہو رہی ہے۔تیسری دنیا میں تو امریکی حکام کا نام نفرت کی علامت بنتا چلا جا رہا ہے۔یورپ کے متعدد ممالک میں بھی امریکہ کے جارحانہ رویے کو محسوس کیا جانے لگا ہے اور خود امریکہ کے دانشور طبقوں نے بھی حال ہی میں نسبتاً بڑی سطح پر امریکی حکومت کی جارحیت کا نوٹس لیا ہے اور کڑے لفظوں میں اس کی مذمت کی ہے۔ایسے حالات میں امریکہ کا سعودی عرب کے حکمرانوں سے یہ توقع رکھنا کہ وہ عراق کے خلاف امریکی جارحیت کی ۱۹۹۱ء کی طرح یا کسی نہ کسی طرح تائید کریں،ایک مشکل امر ہے۔اگر سعودی عرب کے حکمران چاہیں بھی تو ان کے لئے بہت مشکل ہے۔کیونکہ انہیں بخوبی اندازہ ہے کہ اس وقت عالم اسلام میں عمومی طور پر اور عالم عرب میں خصوصی طور پر امریکی حکام کی عالمی بے انصافیوں کے خلاف شدید ردعمل پایا جاتا ہے۔ایسے حالات میں عراق پر امریکی حملے کی حمایت کرنا سعودی عرب کے لئے کسی طور ممکن ہی نہیں ہے۔چنانچہ اس معاملہ میں سعودی حکومت کے صاف جواب کے نتیجہ میں امریکی حکام نے بڑے سلیقے سے سعودی حکومت کو بلیک میل کرنے کی کوشش کی ہے۔سیدھے لفظوں میں یہ جتا دیا گیا ہے کہ اگر عراق پر حملہ کی صورت میں ہماری حمایت نہ کی تو پھر تھنک ٹینک کی رپورٹ ہمارے پاس پہلے سے موجود ہے اور ہم کسی بھی وقت سعودی عرب کو بھی دہشت گردی میں ملوث قرار دے دیں گے۔

ایک پہلو سے یہ دھمکی سعودی عرب کو وقتی طور پر دباؤ ڈال کر اپنی بات منوانے کی چال ہے تو دوسری طرف ساری دنیا پر اپنی ''دہشت گردی کے خلاف مہم'' کی دھاک بٹھانے کے بعد امریکہ



اب یہودی ایجنڈے پر عمل کرنے کے فائنل راؤنڈ میں داخل ہونے کی تیاری کر رہا ہے۔میں نے اپنے کالم زیرِ ذیلی عنوان ''تاریخ سے فرار کیوں؟'' میں واضح کیا تھا کہ گریٹر اسرائیل کے لگ بھگ نصف صدی پرانے نقشہ کے مطابق یہودیوں نے مکہ اور مدینہ کو بھی گریٹر اسرائیل کا حصہ بنا رکھا ہے۔اور یہی امریکی تھنک ٹینک کی رپورٹ ریلیز کرنے کا دوسرا اور اہم مقصد ہے۔عراق اور ایران سے نمٹنے کے بعد امریکہ اندازہ لگائے گا کہ اب وہ قلب اسلام پر حملہ کر دے یا نہیں؟

بہانہ تو اب امریکہ کے پاس گھڑا گھڑایا موجود ہے۔جس ملک میں گھسنا ہو وہاں القاعدہ اور طالبان کو داخل ہوتے دیکھنے کا اعلان کر دیجئے اور پھر ان کے تعاقب میں اس ملک میں گھس جایئے۔کون مائی کا لال آپ کو اس ''نیک کام'' سے روک سکتا ہے۔یہ رویہ کسی بھی ملک کی خود مختاری کے خلاف براہ راست حملہ ہے اور بے شک امریکہ کو ایسے حملے کرنے کی عادت ہو چکی ہے۔لیکن اگر امریکہ نے مستقبل کے یہودی عزائم کی تکمیل کے لئے درپردہ عملی اقدامات شروع کر دیئے ہیں تو پھر ''واشنگٹن پوسٹ'' کی مذکورہ بالا رپورٹ کو اس تناظر میں انتہائی خطرے کی گھنٹی سمجھ لینا چاہئے۔لیکن یہ خطرے کی گھنٹی خود امریکہ اور اسرائیل کے لئے بھی تباہ کن ثابت ہو سکتی ہے۔

ارض حجاز مکہ اور مدینہ کے معاملے میں دنیا بھر کے مسلمان،گنہگار ترین مسلمان بھی بے حد جذباتی ہیں۔اس سلسلے میں مجھے آغا حشر کاشمیری کا ایک واقعہ یاد آرہا ہے۔آغا حشر ڈرامہ نگار تھے،تھیٹریکل کمپنیوں سے وابستہ تھے۔پینا پلانا ان کے روزمرہ کا معمول تھا۔ایک دن محفل ناؤ نوش جمی ہوئی تھی،آغا حشر کو خاصی چڑھی ہوئی تھی اسی دوران ان کے ایک بے تکلف ہندو دوست نے بے تکلفی کی لہر میں حضور اکرم ﷺ کی شان اقدس کے خلاف کوئی نازیبا سی بات کہہ دی۔آغا حشر کا نشہ ہرن ہو گیا۔شراب کی جو بوتل ان کے ہاتھ میں تھی وہی اس دوست کے سر پر دے ماری اور پھر کہنے لگے میرے پلے تو کچھ بھی نہیں ہے،صرف اسی نام کا ایک آسرا ہے جو میری نجات کا سبب بن سکتا ہے اور تم اسی کے خلاف بکواس کر رہے ہو۔میں ماضی قریب کی تاریخ سے بڑے اور اہم ترین واقعات کی مثالیں دینے کے بجائے صرف اسی معمولی سے واقعہ کو بیان کرنا ہی کافی سمجھتا ہوں۔خطرے کی گھنٹی آگے چل کر طبل جنگ بن سکتی ہے۔اس کا ایک نتیجہ تو امریکہ کی اپنی توقعات کے مطابق ہو سکتا ہے کہ وہ جیسے ساری دنیا میں دندناتا پھرتا ہے ویسے ہی عالم اسلام کے مقدس ترین مقامات کو بھی یہودی عزائم کے مطابق کر دے۔لیکن اس کا دوسرا نتیجہ یہ بھی نکل سکتا ہے کہ

پورے عالم اسلام کی حکومتیں بے بس ہو جائیں اور پورا عالم اسلام ''نا قابل تسخیر'' سمجھے جانے والوں کی تاریخ اور جغرافیہ سب کچھ تبدیل کر کے رکھ دے۔

ابابیلوں کا ایک واقعہ پہلے بھی ہو چکا ہے۔

میں امید کرتا ہوں کہ امریکہ کے جن ساٹھ دانشوروں نے بڑے پیمانے پر صدر بش کی جارحانہ پالیسیوں کی شدید الفاظ میں مذمت کی تھی وہ اس سے بھی زیادہ سخت لفظوں میں امریکی حکومت کو اس کے مستقبل کے ان مذموم عزائم سے روکنے کے لئے آواز بلند کرے گی تا کہ امریکی حکمران مزید ایسے اقدامات نہ کریں جن سے دنیا کی مکمل تباہی کا خطرہ حقیقت بن جائے۔

☆☆☆



# جنرل مشرف، بےنظیر اور شریف فیملی

بے نظیر بھٹو اور شہباز شریف کی واپسی کے بارے میں ایک عرصہ سے متضاد خبریں آ رہی ہیں۔کبھی ''شیر آیا۔۔شیر آیا'' کی طرح دونوں کی واپسی کا شور مچتا ہے تو حکومت کی طرف سے فوری طور پر سخت الفاظ میں اس کی تردید کردی جاتی ہے۔لیکن اس کے ساتھ اگر اس سارے کھیل کو ذرا دھیان سے دیکھا جائے تو جنرل پرویز مشرف کی حکومت کی طرف سے بھی بعض سگنلز معنی خیز رہے ہیں۔مثلاً ایک مرحلہ پر نواز شریف کی حب الوطنی کی بالواسطہ طور پر توثیق کی گئی اور بے نظیر بھٹو کو ''سیکیورٹی رسک'' قرار دیا گیا۔پھر ایک مرحلہ میں بے نظیر کے لئے نرم رویے کا اظہار کیا گیا تو شریف فیملی کے لئے لہجے میں سختی پیدا کر لی گئی۔نواز شریف اور بے نظیر دونوں نے اپنی اپنی سیاسی حکمت عملی سے جب جنرل پرویز مشرف کے مطالبے کے مطابق خود کو اپنی سیاسی پارٹیوں کی انتخابی عملی صورتحال سے الگ کر لیا تو توقع تھی کہ اب جنرل پرویز مشرف کے رویے میں لچک آئے گی۔لیکن کسی لچک کے برعکس حکومت کے رویے میں یکا یک مزید سختی آ گئی۔

اگرچہ یہ سارا اقتدار کا کھیل ہے اور پاکستان کے غریب عوام کو اس کھیل سے اب کوئی خاص دلچسپی نہیں رہ گئی۔تاہم اس خطے پر بین الاقوامی اثرات کے باعث پاکستانی اقتدار کی سیاست بھی تھوڑی سی زیادہ اہمیت حاصل کر گئی ہے۔اس سیاست کے مرکزی کرداروں اور ان

کے رویوں کے حوالے سے اس صورتحال کو سمجھنے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔

بے نظیر بھٹو بین الاقوامی سطح پر ایک اہمیت کی حامل سیاستدان ہیں۔ان کی سیاسی سوجھ بوجھ سے انکار کرنا ممکن نہیں ہے۔ان کے مراسم موثر عالمی سیاسی شخصیات سے ہیں اور ان مراسم میں ان کی اپنی سیاسی دانشمندی کا بہت دخل ہے۔ان کی پارٹی لبرل خیالات کی حامل ہے،مغرب کے نزدیک فکری لحاظ سے کسی بھی دوسرے اہم لیڈر کے مقابلہ میں بے نظیر بھٹو زیادہ قابل قبول ہیں۔انڈیا سے ان کے دوستانہ رویے کو منفی رنگ میں بھی لیا گیا لیکن میرا خیال ہے اسے مثبت انداز سے دیکھا جائے تو یہ رویہ پورے خطے کی بھلائی کے لئے مفید ثابت ہوسکتا ہے۔

شریف فیملی میں سے اگر نواز شریف کو وقتی طور پر سیاست سے الگ بھی رکھا جائے تو شہباز شریف اور کلثوم نواز کی صورت میں نواز شریف کے سیاسی اثرات سے جان نہیں چھڑائی جا سکتی۔نواز شریف اگرچہ عالمی سطح پر اتنی اہمیت کے حامل نہیں ہیں تاہم انڈیا کے ساتھ ان کے دوستانہ مراسم بہرحال برصغیر پاک و ہند کی بھلائی کے لئے کارآمد ثابت ہوسکتے ہیں۔

دونوں لیڈروں یعنی بے نظیر اور نواز شریف (شہباز شریف) میں یہ مشترکہ خوبی موجود ہے کہ یہ لوگ بھارت کے ساتھ دوستانہ مراسم قائم کرانے میں ممد ہو سکتے ہیں۔اگرچہ بھارت کے بعض اہم ڈپلومیٹس بے نظیر کے بارے میں کچھ تحفظات رکھتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ جب بھی بے نظیر برسر اقتدار آئی ہیں کشمیر کا مسئلہ بھارت کے لئے زیادہ دردسر بنا دیا جاتا رہا ہے۔اس لحاظ سے شریف خاندان بے نظیر سے بھی زیادہ کارآمد ہوسکتا ہے۔تاہم مجموعی طور پر دونوں بڑی جماعتوں کی یہ اصل قیادت فی الوقت یقینی طور اس مقام پر ہے کہ برصغیر میں کشیدگی کی خطرناک صورت حال کو ختم کرا سکے۔ایسے افراد کے ہوتے ہوئے جنرل پرویز مشرف گزشتہ تین برس سے مسلسل انڈیا سے مذاکرات کرنے کی درخواستیں کئے جا رہے ہیں لیکن اس سیاسی قیادت سے استفادہ کرنے کو تیار نہیں ہیں جو اس سلسلے میں پل کا کام انجام دے سکتی ہے۔انڈیا ہر بار ان کی مذاکرات کی اپیل جھٹک دیتا ہے،حکومت اس کا برا نہیں مناتی لیکن دونوں بڑی جماعتوں کے مذکورہ قائدین سے ربط کرنے کو اپنی توہین سمجھتی ہے۔اپنے اپنے ذہن کی بات ہے۔

جنرل پرویز مشرف نے دونوں پارٹی رہنماؤں پر ملک کو لوٹنے کے جو الزامات لگائے ہیں ،اگر وہ سچ ہیں تو پھر ان کا احتساب پورے پاکستانی نظام تک جانا چاہئے تھا۔صرف ان دو



جماعتوں سے آگے بڑھ کر ان سیاستدانوں کا بھی احتساب ہونا چاہئے تھا جو پہلے ان دونوں میں سے کسی نہ کسی کے ہمرکاب رہے اور مبینہ لوٹ مار میں شریک رہے اور اب جنرل پرویز مشرف کی سیاسی مجبوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کے قریب آ چکے ہیں۔اسی طرح احتساب کا یہ سلسلہ پوری ایمانداری اور نیک نیتی کے ساتھ سیاستدانوں، بیوروکریسی،فوج کے اعلیٰ حکام اور عدلیہ تک جانا چاہئے تھا۔ابھی تک اس حوالے سے سرکاری کارکردگی اتنی یک رخی ہے کہ بعض مضبوط کیس ہونے کے باوجود اب یہ احتساب ''انتقامی'' لگنے لگا ہے۔یہ جملہ معترضہ بیچ میں آ گیا وگرنہ یہ ایک الگ موضوع ہے جس پر کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔

اب اس سارے منظر کا ایک اور رخ بھی دیکھیں۔۔۔اگر نواز شریف اور بے نظیر دونوں کے بھارت کے ساتھ خوشگوار مراسم ہیں اور ان کا سیاسی اثر رسوخ ہے تو کیا ایسا ممکن نہیں ہے کہ بھارت انہیں کے اشارے پر، یا ان کی حمایت کے جذبے کے ساتھ بہانہ بنا کر فوجیں سرحدوں پر لے آیا ہو؟ میرے نزدیک اس کا امکان موجود ہے۔بے شک اس سلسلے میں امریکہ کی منظوری کے بغیر انڈیا اس حد تک نہیں جا سکتا تھا لیکن اس منظوری کے ملنے میں بھی دیگر عوامل کے ساتھ مذکورہ دونوں سیاسی لیڈر بھی اثر انداز ہونے میں کامیاب ہوئے ہوں تو بعید از قیاس نہیں ہے۔میرے اس مفروضے کو اس امر سے مزید تقویت ملتی ہے کہ انڈیا نے اکتوبر تک فوجیں لازماً سرحدوں پر رکھنے کا اعلان کر رکھا ہے اور اکتوبر ہی میں پاکستان میں انتخابات ہو رہے ہیں۔گویا انڈین فوجیں پاک فوج کے ذریعے پاکستان کے انتخاب کرا کے ہی سرحدوں سے واپس جائیں گی۔کیا اب یہ مفروضہ ایک واضح امکان نہیں بن جاتا؟

میں ایک عرصہ سے انہیں خطوط پر سوچ رہا ہوں اور پہلے پہل مجھے دونوں لیڈروں کے رویے پر افسوس ہوا تھا کہ وہ واقعی ایسا کر کے پاکستان کے لئے سیکیورٹی رسک بن رہے ہیں۔۔۔لیکن اب جب کہ جنرل پرویز مشرف اپنی تمام تر نیک نیتی کے باوجود ویسے ہی خوشامدیوں کے نرغے میں گھر چکے ہیں جیسے خوشامدیوں نے پاکستان کے ہر حکمران کو گھیر کر ملک کو مسلسل برباد کیا ہے،ایسے حالات میں اگر بے نظیر اور شریف فیملی نے اپنے بس کے مطابق امریکہ اور بھارت سے کہہ کر بھارتی فوجی دباؤ ڈالنے میں کوئی کردار ادا کیا ہے تو پھر اسے اتنا زیادہ برا بھی نہیں کہا جا سکتا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آگے کیا ہوگا؟۔۔۔۔۔۔۔۔دراصل جنرل پرویز مشرف جیسے یکا یک امریکہ کے پسندیدہ حکمران بن گئے تھے، ویسے ہی یکا یک امریکہ ان سے آنکھیں پھیرنے لگا ہے۔امریکی حکمرانوں کی پسندیدگی کا معیار ان کے اپنے مفادات اور ان کے اپنے مطالبات ہیں۔جنرل پرویز مشرف اپنے لبرل خیالات اور اپنے فوجی ساتھیوں کی حدود کے مطابق جہاں تک امریکی مطالبات پورے کرسکتے تھے، پورے کرتے رہے ہیں۔اب اندر کی بات اتنی ہی سمجھ میں آتی ہے کہ امریکہ حالیہ دنوں میں جنرل پرویز مشرف سے کچھ اور مطالبات اور تقاضے کر رہا ہے جنہیں پورا کرنا شاید ان کے لئے مشکل ہو رہا ہے۔ان امریکی مطالبات اور اپنی مشکلات کو جنرل پرویز مشرف خود بہتر جانتے ہوں گے۔اگر جنرل پرویز نئے امریکی مطالبات کا کڑوا گھونٹ پی لیتے ہیں تو وہ ابھی الیکشن ملتوی کر کے مزید پانچ سال کے لئے سپریم کورٹ سے اجازت لے لیں، امریکہ کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا اور یورپی یونین کی موجودہ انتخابی مبصر ٹیم بھی مسکراتی ہوئی پاکستان سے چلی جائے گی۔کہیں کوئی شور نہیں ہوگا۔۔۔۔اگر وہ امریکی مطالبات پورے نہیں کرتے تو پھر یہ بھی ممکن ہے امریکہ دباؤ ڈال کر بے نظیر اور شہباز شریف کی وطن واپسی ممکن بنادے۔اور اکتوبر کے انتخابات کے بعد ۱۹۷۷ء جیسی تحریک بھی چلوائی جاسکتی ہے۔امریکہ کو پاکستان میں ایسی تحریک چلوانے کا کامیاب تجربہ ہے۔

بے نظیر کی وطن واپسی کا قصہ ہو یا شہباز شریف اور کلثوم نواز کی واپسی کا مسئلہ اس کا حتمی فیصلہ امریکہ کرے گا اور اس کے فیصلے کا انحصار امریکہ کے نئے مطالبات پر جنرل پرویز مشرف کے رویے پر ہے۔۔۔باقی کاہے کی جمہوریت اور کاہے کی مختاری و خودمختاری۔ناحق سب مجبوروں پر اک تہمت ہے مختاری کی۔

جمہوریت تو ہمارے ملک میں مظلوم مختاراں بی بی کی طرح ہے۔

☆☆☆



# گیارہ ستمبر اور نئے عالمی امکانات

گیارہ ستمبر ۲۰۰۲ء کو نیویارک کے ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی جڑواں عمارتوں کی تباہی کے واقعہ کو ایک سال پورا ہو چکا ہے۔گزشتہ سال جن ہوائی حملوں کے باعث یہ عمارتیں تباہ ہوئیں، تاحال دنیا کو اس کے اصل مجرموں کے بارے میں کوئی تسلی بخش ثبوت نہیں دیئے جا سکے۔محض القاعدہ اور طالبان پر الزام تراشی کر کے اور دنیا کے غریب ترین، کمزور ترین اور ہر لحاظ سے پسماندہ ترین ملک افغانستان پر حملے کئے گئے۔اپنے نئے اسلحہ کے تجربات کو عملاً آزمایا گیا اور اسی کو اپنی طرف سے مبینہ دہشت گردی کے خلاف مہم قرار دے دیا گیا۔

میں نے اس موضوع پر بہت پہلے بھی لکھا تھا کہ اگر واقعی القاعدہ اور طالبان نے مل کر ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی دونوں عمارتیں تباہ کی تھیں تو افغانستان کے خلاف اپنی تمام تر انسانیت سوز کارروائیوں کے باوجود امریکہ ان کارروائیوں میں حق بجانب ہے۔ہمارے محلوں اور شہروں کے کسی بڑے آدمی کو کوئی سرِعام اس طرح ذلیل کر دے تو وہ بھی غصے سے پاگل ہو کر کیا کچھ کر بیٹھتا ہے۔یہ تو پھر دنیا کی بظاہر سب سے بڑی طاقت کے ساتھ ہاتھ ہوا تھا۔اور ہاتھ بھی دنیا کے سب سے کمزور ترین ملک میں رہنے والوں نے کیا تھا۔یہ میں اس مفروضے کی بنیاد پر بات کر رہا ہوں جسے امریکی حکومت ابھی تک شواہد کے ساتھ ثابت نہیں کرسکی۔ایسے شواہد جسے خود امریکی عدالتیں بھی قبول کرسکیں۔

اب امریکہ کو برا بھلا کہہ کر یا صدرِ امریکہ بُش جونیئر کی عالمی دہشت گردی کا نشانہ بننے

والوں سے ہمدردی کر کے بات ختم نہیں ہو رہی۔ دنیا ایک نئے سامراجی دور میں داخل ہو چکی ہے۔اقوام متحدہ کا وجود خطرے میں پڑنے لگا ہے۔ایسا کسی نئی اقوام متحدہ کی تشکیل کے احساس کے باعث نہیں بلکہ امریکی دھونس کے باعث ہونے لگا ہے۔ضرورت تو اس امر کی تھی کہ تیسری دنیا کے ممالک بعض ترقی یافتہ ممالک کے ساتھ مل کر ایسی نئی اقوام متحدہ بناتے جو انہیں امریکی جارحیت کا سامنا کرنے کے لئے یک جا کر دیتی۔لیکن معاملہ اس کے برعکس ہو رہا ہے،امریکہ خود اقوام متحدہ کو دھمکی کے انداز میں کہہ رہا ہے کہ عراق کے سلسلے میں جلدی فیصلہ کر لو ورنہ میں اقوام متحدہ کی کسی رائے کے بغیر ہی حملہ کر دوں گا۔ایسے حالات میں بھی باقی ساری دنیا ابھی تک اپنی اپنی مصلحتوں میں اسیر ہے۔آج دنیا کے مختلف اہم ممالک اور خطے کن مصلحتوں یا مخمصوں کا شکار ہیں؟ ان سب کی مجبوریوں اور مصلحتوں سے امریکہ کس طرح فائدہ اٹھا رہا ہے؟ اور نئے عالمی امکانات کیا ہیں؟

آج اسی حوالے سے کچھ بات ہوگی۔

بُش خاندان کے ذریعے عالمی امریکی کردار کے باعث مجھے ہمیشہ سوویت یونین روس کے ٹوٹنے کا افسوس رہے گا۔چند اسلامی ممالک کے سوا سارے اسلامی ممالک ہمیشہ سے امریکہ نواز رہے۔بے شک اس میں امریکہ کے بعض مثبت اقدامات اور دوستانہ رویوں نے بھی بنیادی کردار ادا کیا۔امریکہ سے دوستی اور محبت کا سلسلہ چلنا چاہئے تھا لیکن اتنا نہیں کہ اس دوستی میں اسلامی ممالک ''یک طرفہ عشق'' کے مقام تک پہنچ کر سوویت یونین سے مکمل بگاڑ پیدا کر لیتے۔گزشتہ نصف صدی میں سوویت یونین اور امریکہ کی سرد جنگ میں اسلامی ممالک نے نفسیاتی طور پر ہراول دستے کا کام کیا۔سوویت یونین کو خدا کا منکر کہہ کر اس کے خلاف مسلمانوں میں شدید نفرت پیدا کر دی گئی۔اتنی نفرت تو خود امریکی بھی سوویت یونین سے نہیں کرتے تھے۔پھر افغانستان کے مسئلہ پر جس طرح سارا عالم اسلام امریکہ کی سرپرستی میں متحد ہوا، ویسا اتحاد تو اب شاید ہی کبھی دیکھنے میں آ سکے۔میرا خیال ہے کہ سوویت یونین قائم رہتا تو دنیا کے مختلف خطوں میں چھوٹی موٹی گڑبڑ تو ہوتی رہتی لیکن دو بڑی طاقتوں کے درمیان کشمکش سے دوسرے ممالک نسبتاً محفوظ و مامون رہتے۔کم از کم اتنے برے حالات کبھی نہ ہوتے جیسے اب امریکہ کے ہاتھوں ہوتے جا رہے ہیں۔

اب عالم اسلام کا مسئلہ یہ ہے کہ اس کے تمام مصائب اور دکھوں کا علاج اس کے مکمل اتحاد



میں ہے لیکن یہ قوم ''اتحاد عالم اسلام'' کی دوا پینے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہے۔بڑی سطح کے اتحاد کو تو چھوڑیں۔۔۔۔ہر مقامی سطح پر بھی مسلمان اتنے تقسیم در تقسیم ہو چکے ہیں کہ ایک موثر علاج موجود ہونے کے باوجود بیماری کا علاج ممکن ہی نہیں ہے۔ایسے حالات میں کیا اسلامی ممالک باری باری امریکہ کا نشانہ بن کر ''افغانستان'' بنتے رہیں؟ میرا خیال ہے کہ اگر سارے اسلامی ممالک نے افغانستان بننا ہے تو ایک ہی بار بن لیا جائے۔ورنہ مصلحت اور حکمت سے کام لے کر امریکہ سے کسی بھی الجھاوے سے بچنے کی کوشش کی جائے۔اور یہ جان لیا جائے کہ خصوصی طور پر گزشتہ نصف صدی میں اسلامی ممالک کے حکمرانوں نے جو سنگین قائدانہ غلطیاں کی ہیں اب اگلی نصف صدی تک ان سب غلطیوں کا ادراک کرتے ہوئے ان کی موثر تلافی کی جائے۔اسلام کے آفاقی اصولوں کے مطابق اپنے شہریوں کو جدید علوم کی اعلیٰ تعلیم کی سہولتوں سے لے کر علاج معالجہ اور بنیادی ضروریات زندگی کی فراہمی تک کو اپنی ترجیحات میں شامل کریں۔(بیشتر مغربی ممالک انہیں ''اسلامی اصولوں'' پر از خود عمل کر رہے ہیں)۔

اگر اسلامی ممالک امریکہ کے معاملات سے بالکل الگ تھلگ ہو جاتے ہیں تو پھر بظاہر امریکہ کے سامنے چین اور روس کی فوجی قوت اور جاپان کی اقتصادی قوت کسی نہ کسی رنگ میں چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے۔امریکہ تیل کے جن ذخائر پر اپنے ڈھیلے ڈھالے قبضے کو مکمل قبضہ کی صورت دینا چاہتا ہے،(اسرائیل کے مخصوص عزائم کی تکمیل کے باوجود) اس میں امریکی اضافی مقصد در اصل ایک طرف چین اور روس پر اپنی فوجی دھاک بٹھانا ہے تو دوسری طرف جاپان کی اقتصادی قوت کا مقابلہ بھی کرنا ہے۔

افسوس یہ ہے کہ روس کے ساتھ بیشتر اسلامی ممالک کے تعلقات ''عدم اعتماد'' میں گھرے ہوئے ہیں۔چین کے بھی گزشتہ چند برسوں سے اسلامی جہادی گروپوں کی سرگرمیوں کے باعث اسلامی ممالک کے معاملے میں بہت سے تحفظات ہیں۔اپنی داخلی پالیسی کے حوالے سے یہ چین کا حق بھی ہے کہ وہ ایسے تحفظات رکھے۔افغانستان میں طالبان کے آخری دنوں میں گوتم بدھ کے عظیم تاریخی مجسمہ کی مسماری نے جاپان جیسے بھلے مانس ملک کو بھی اسلام اور اسلامی ممالک سے خاصا متنفر کر دیا۔ان حالات میں ان میں سے کسی ملک سے یہ توقع رکھنا فضول ہے کہ وہ ایک منتشر عالمی اسلامی بلاک کے لئے امریکہ سے کوئی پنگا کرے۔

اس کے باوجود امریکہ کے لئے ایک نیا اور بڑا چیلنج ابھر کر سامنے آ رہا ہے۔ یہ نہایت آہستگی سے ابھرنے والا چیلنج یورپی ممالک کی طرف سے ہے۔ یورپی ممالک پر امریکہ کے بہت سے احسانات ہیں۔ جنگ عظیم دوم کے بعد بعض یورپی ممالک کی تعمیر نو میں امریکہ نے بہت مدد کی تھی۔ اسی احسان کے باعث یورپی ممالک ابھی تک امریکہ کی بہت سی جائز، ناجائز مانتے آ رہے ہیں۔ برطانیہ کا امریکہ کی حمایت کا عالمی کردار اگرچہ بہت سے لوگوں کے نزدیک تمسخر کا نشانہ بنا ہے لیکن اگر دیکھا جائے تو برطانیہ ایک عجیب ''سیاسی ثقافتی بحران'' سے دوچار ہے، وہ یورپی یونین کا حصہ بنا رہنا چاہتا ہے کیونکہ وہ اسی یورپی خطے سے تعلق رکھتا ہے۔ دوسری طرف پورا یورپ برطانیہ کے لئے اجنبی زبانوں کا ایسا خطہ ہے جہاں وہ خود کو اجنبی محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس کے برعکس امریکہ سے جغرافیائی فاصلے پر ہونے کے باوجود، برطانیہ کے لسانی اور بہت سے ثقافتی رشتے امریکہ سے بنتے ہیں اور واقعی بنتے ہیں۔ اس لئے برطانیہ، یورپ اور امریکہ کی کشمکش میں کوئی فیصلہ کن کردار ادا کرنے کے باوجود ذہنی طور پر گومگو کی کیفیت میں رہے گا۔

برطانیہ کو چھوڑ کر باقی یورپ کی عمومی صورتحال یورپی یونین کے ساتھ جڑ کر چلنے کی ہے۔ اس وقت فرانس اور جرمنی کی حکومتوں کے طرز عمل کو یورپ کے عمومی مزاج کا ترجمان کہا جا سکتا ہے۔ فرانس کی حکومت نے حالیہ دنوں میں ایران سے تعلقات سمیت متعدد عالمی امور میں اپنے قومی مفادات کے مطابق فیصلے کئے ہیں اور اس سلسلے میں امریکہ کی خواہشات کو بڑے ڈپلومیٹک طریقے سے نظر انداز کیا ہے۔ یاد رہے کہ گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء کے بعد سے اب تک فرانس سے تین ایسی کتابیں چھپ چکی ہیں جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ گیارہ ستمبر کا سانحہ ''کسی اور'' کی سازش ہے۔

جرمنی کی تعمیر نو میں امریکہ کا بہت بڑا حصہ ہے۔ جرمن قوم نے جنگ عظیم میں امریکی حملوں کو تو کسی حد تک بھلا دیا ہے لیکن جنگ کے بعد امریکی احسانات کو یاد رکھا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سی امریکی خواہشات کو پسند نہ کرنے کے باوجود جرمن حکومت امریکہ کا ساتھ دیتی رہی ہے۔ مشرقی جرمنی اور مغربی جرمنی کا ملاپ بظاہر تو سوویت یونین کی شکست اور امریکہ کی فتح تھا لیکن اس کے بعد کے اثرات مسلسل امریکہ کے بنیادی مفادات کے خلاف جا رہے ہیں۔ اس اتحاد کے باعث جرمن قوم پرستی کا جذبہ ایک بار پھر سر اٹھا رہا ہے۔ نیونازی تحریک کی صورت میں



ہٹلر کے دور کو یاد کیا جانے لگا ہے۔ ابھی تک جرمن حکومت ایسے افراد کی حوصلہ شکنی کر رہی ہے۔ بظاہر یہ تحریک جرمنی میں مقیم تمام غیر ملکی افراد کے خلاف ہے۔ اسی وجہ سے بعض ترک خاندان بھی اس تحریک کا نشانہ بنے۔ لیکن میرے نزدیک یہ تحریک پہلے ہی کی طرح اینٹی یہودی تحریک ہے۔ اس سلسلے میں چند بنیادی نوعیت کے شواہد سامنے آئے ہیں۔ مثلاً متعدد بار ایسا ہوا کہ یہودی قبرستان میں ان کی قبروں کو ادھیڑا ہوا پایا گیا جو یہودیوں سے گہری نفرت کا اظہار ہے۔ جرمنی کے مشرقی حصہ برلن میں ایسا کئی بار ہو چکا ہے (یہی علاقہ نیو نازی تحریک کا گڑھ ہے) لیکن اب فرینکفرٹ کے علاقہ میں بھی ایسا واقعہ ہو چکا ہے۔ خیال رہے کہ فرینکفرٹ کثیر القومی انٹرنیشنل شہر ہے اور عمومی طور پر ہر طرح کے انتہا پسندانہ تعصّبات سے بچا ہوا ہے۔ یہاں ایسے وقوعہ کا ہونا زیادہ تشویشناک ہے۔۔۔۔ کولون کے قریب کسی علاقہ میں ایک بار یہودی عبادت گاہ میں آتش زنی کا چھوٹا سا سہی لیکن تخریبی واقعہ ہو چکا ہے۔۔۔۔ جرمنی میں یہودیوں کی تنظیم کے سربراہ Ignaz Bubis (جو اَب وفات پا گئے ہیں) ایک جرمن ٹی وی چینل پر انٹرویو دیتے ہوئے بتا رہے تھے کہ انہیں ایسی ٹیلی فون کالز آتی ہیں جن میں یہودی ہونے کی بنا پر گالیاں دی جاتی ہیں۔ بعض کالز میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہٹلر نے تم لوگوں کے ساتھ ٹھیک کیا تھا اور اب ہٹلر کے حامی پھر آ رہے ہیں۔ وغیرہ۔۔۔۔

اس قسم کے واقعات کو ابھی یہاں عام طور پر ''مسلمان دہشت گردوں'' کے کھاتے میں ڈال دیا جاتا ہے، لیکن حکومت خود بھی بخوبی جانتی ہے کہ یہ سب نیونازی تحریک والے لوگ کر رہے ہیں۔ ایک طرف جرمنی کے اندر اس طرح کا لاوا پک رہا ہے دوسری طرف جرمن حکومت اب امریکی خواہشات کا مزید ساتھ دینے سے انکار کر رہی ہے۔ عراق کے حالیہ قضیہ میں ابھی تک امریکی حکومت کے کڑے تیوروں میں کوئی تبدیلی تو نہیں آئی لیکن یہ حقیقت ہے کہ جرمنی اور فرانس کے ردِ عمل اور یورپی یونین کے عمومی کردار کے باعث امریکہ کو ڈپلومیٹک سطح پر سخت ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اسی ڈپلومیٹک ہزیمت کے باعث ہی امریکہ اقوام متحدہ پر برہمی ظاہر کر رہا ہے۔ عراق کا یکا یک اسلحہ کے معائنہ کے لئے اقوام متحدہ کے انسپکٹروں کو غیر مشروط طور پر انسپکشن کی اجازت دے دینا اور اس پر فوری مثبت عالمی ردِ عمل درحقیقت یورپی یونین کا کارنامہ ہے۔

امریکہ کو اب اصل چیلنج یورپ سے ملے گا اور امریکہ کا مقابلہ بھی یورپ ہی کر سکے

گا۔اقتصادی میدان میں ''یورو'' نے پہلے ہی ڈالرکوزد پر لے رکھا ہے۔ڈپلومیٹک سطح پرامریکہ اب اپنے رویے میں بہتری لائے گا یاچڑ کرمزید جارحانہ انداز اختیار کرلے گا؟اس کا اندازہ جلد ہی ہوجائے گا۔وقتی طور پراگر عالم اسلام اب خاموشی اختیار کرلے تو آنے والے وقت میں امریکہ اور یورپ کا ٹکراؤ ہی برابر کی ٹکر والا ہوگا۔لیکن کتنا اچھا ہو کہ امریکی دانشوراورعوام اپنی حکومت کو امن،محبت،عدل وانصاف اور بھائی چارے کی عالمی فضا قائم کرنے والا کردارادا کرنے کے لئے زور دیں۔امریکہ دنیا کا بڑا بھائی یا باپ بننا چاہتا ہے تو اب کسی کو اس پر اعتراض نہیں ہوگا۔اعتراض صرف اس بات پر ہوگا کہ اس بڑے بھائی یا باپ کو انصاف کرنا نہیں آتا۔اور بڑے کا جتنا ظرف بڑا ہونا چاہئے وہ اس کے بالکل برعکس ظرف کا مظاہرہ کررہا ہے۔

☆☆☆



# متحدہ مجلس عمل کی کامیابی،
# امریکہ اور افغانستان

پاکستان کی قومی اسمبلی اور چاروں صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات مکمل ہو چکے ہیں۔شکوک و شبہات اور گہما گہمی کے درمیان ہوجانے والے یہ انتخابات کئی اہم اثرات کے حامل ہیں۔ان کے بارے میں اہلِ دانش اور سیاسی مبصرین اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہیں گے اور آنے والا وقت ان کے بارے میں اصل حقیقت کو بھی سامنے لاتا رہے گا۔میرے نزدیک اس الیکشن کے دو بڑے سرپرائز ہیں۔ایک یہ کہ جنرل پرویز مشرف نے اپنے وعدہ کے مطابق فیئر اور شفاف انتخاب کرادیئے ہیں۔دوسرا یہ کہ دینی جماعتوں کے اتحاد ''متحدہ مجلس عمل'' نے ناقابلِ یقین حد تک شاندار کامیابی حاصل کی ہے۔صوبہ سرحد میں بلاشرکتِ غیرے ان کی حکومت بن رہی ہے اور بلوچستان کی حکومت میں بھی ان کا ایک فیصلہ کن کردار واضح ہوگیا ہے۔قومی سطح پراگر ان کا اور قائدِاعظم مسلم لیگ کا اتحاد ہوجائے تو ان کی مشترکہ حکومت بھی قائم ہوسکتی ہے۔اس امکان کا ابھر آنا ہی متحدہ مجلس عمل کی بڑی کامیابی ہے،چاہے مرکز میں کسی اور کی ملی جلی حکومت ہی کیوں نہ بن جائے۔

متحدہ مجلس عمل کی اس کامیابی پر بہت سے طبقات نے اپنے تحفظات کا اظہار کیا ہے۔مغربی

ذرائع ابلاغ نے اس حدتک تشویش کا اظہار کیا ہے کہ پاکستان میں بنیاد پرست غالب آ رہے ہیں۔لیکن سرکاری طور پر امریکہ کی طرف سے کسی تشویش کا اظہار نہیں کیا گیا اور جنرل پرویز مشرف نے بھی عوامی فیصلے کا احترام کرنے کا واضح عندیہ دے دیا ہے۔اگر متحدہ مجلس عمل کی کامیابی سے امریکہ کو واقعتاً کوئی تشویش ہوتی تو الیکشن والی رات تمام نتائج کا اعلان ہونے سے پہلے ہی اعلان ہو جاتا کہ ملک کی سلامتی کو سنگین قسم کے اندرونی و بیرونی خطرات لاحق ہو گئے ہیں اس لئے ملک کو بچانے کے لئے مارشل لا لگایا جا رہا ہے۔اسمبلیاں وجود میں آنے سے پہلے ہی ختم کر دی جاتیں، ملک میں خونیں مارشل لاء لگ جاتا۔امریکہ کے نشریاتی ادارے بھی پاکستان کی سلامتی کو لاحق مبینہ ''سنگین خطرات'' کی نہ صرف توثیق کرتے بلکہ ان کی سنگینی کو مزید بڑھا کر بیان کرتے۔مارشل لا کا خیر مقدم کیا جاتا اور پاکستان کو دوسرا الجزائر بنا دیا جاتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔۔۔اور ایسا اس لئے نہیں ہوا کہ شاید امریکہ کو متحدہ مجلس عمل کی کامیابی سے خود اپنی کسی کامیابی کی امید ہے۔لیکن اس کا ذکر آخر میں۔۔۔۔پہلے تھوڑا سا ماضی میں سفر کرتے ہیں۔

انگریزوں کے دور اقتدار میں مدرسہ علی گڑھ اور مدرسہ دیوبند کی صورت میں دو متوازی تحریکیں شروع ہوئیں۔سر سید احمد خان اور مولانا محمدؐ قاسم نانوتوی۔۔۔دونوں کے پیش نظر اسلامیانِ ہند کی بھلائی اور خیر خواہی تھی اور دونوں کا اپنا اپنا الگ انداز نظر تھا۔تحریک پاکستان شروع ہوئی تو علی گڑھ کالج سے وابستہ شخصیات نے عمومی طور پر پاکستان کی حمایت کی جبکہ مدرسہ دیوبند کے اکابرین نے اس کی مخالفت کی۔ایک اور محدود متوازی اسلامی تحریک جماعت اسلامی کے مولانا مودودی صاحب نے بھی قائداعظم کے پاکستان اور مسلم لیگ کے ریزولیشن کی کھل کر مخالفت کی۔پاکستان بن گیا تو مولانا مودودی پاکستان میں آ گئے اور پاکستانی سیاست میں اپنا کردار ادا کرتے رہے۔مدرسہ دیوبند سے وابستہ بیشتر اہم شخصیات بھی پاکستان میں آ گئیں۔پاکستان کی قومی سیاست میں دیوبند کے علماء مقدور بھر حصہ لیتے رہے۔پاکستان میں مدرسہ دیوبند اور جماعت اسلامی کو اس وقت نمایاں اہمیت ملی جب امریکہ نے افغانستان میں سوویت یونین روس کے خلاف افغانیوں سے جہاد میں شدت پیدا کرائی۔اس کے عسکری امور سے قطع نظر تب اس جہاد کے بیشتر مجاہدین پاکستانی مدارس دیوبند سے دینی تربیت حاصل کرتے رہے۔سوویت یونین کی شکست و ریخت کے بعد جب امریکہ نے اس سارے کھیل سے لاتعلقی اختیار کر لی اور سالہا



سال کی خانہ جنگی کے بعد طالبان نے یہاں کا اقتدار سنبھالا تو دیوبندی مکتبہ فکر کی اہمیت میں مزید اضافہ ہو گیا۔کیونکہ طالبان کا ذہنی میلان اسی مکتبہ فکر کی طرف تھا۔

گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء کے بعد جب طالبان امریکی عتاب کا شکار ہوئے تو اس کے نتیجہ میں پاکستان میں دیوبندی مکتبہ فکر کو بھی شدید دباؤ کا سامنا کرنا پڑا۔''انجمن سپاہ صحابہ'' اور ''لشکر جھنگوی'' جیسی جہادی تنظیموں پر پابندی عائد کی گئی تو اس کا اثر بھی دیوبند مسلک کے اکابرین پر پڑا کیونکہ مذکورہ تنظیمیں عقائد کی فروعی سطح پر ان ہی کے زیر اثر تھیں۔عالمی دباؤ کے ساتھ مکتبہ دیوبند اس وجہ سے اندرونی دباؤ میں بھی تھا۔

ایسی فضا میں جمیعتہ العلماء اسلام اپنے مخصوص سیاسی حلقوں میں اپنی عوامی مقبولیت کے باوجود کوئی فعال سیاسی کردار ادا کرنے سے قاصر تھی۔دوسری طرف جماعت اسلامی بھی امریکہ کے خلاف اپنے واضح موقف کے باوجود کسی حد تک عالمی دباؤ میں آئی ہوئی تھی۔ایسی فضا میں جب الیکشن کے دن سر پر آ گئے تو جمیعتہ العلماء اسلام اور جماعت اسلامی نے مل کر نہ صرف متحدہ مجلس عمل قائم کر ڈالی بلکہ خود کو کسی حد تک پیچھے رکھ کر اس کی زمام اقتدار سواد اعظم کے عقیدہ سے وابستہ جمعیتہ العلمائے پاکستان کے مولانا شاہ احمد نورانی کے سپرد کر کے اپنی سیاسی بصیرت کا ثبوت بھی دے دیا۔ بلکہ مولانا شاہ احمد نورانی کی اقتداء میں نمازیں ادا کر کے اس دیرینہ اعتراض کو بھی دور کر دیا کہ یہ علماء تو ایک دوسرے کے پیچھے نماز بھی نہیں پڑھ سکتے، عملی زندگی کا اتحاد کیا کریں گے؟۔خدا کرے کہ یہ نمازیں ان علماء کی محض سیاسی نمازیں نہ ہوں اور آئندہ بھی یہ سب ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھ لینا جائز رکھیں۔اتحاد باہمی کی ایسی کم از کم صورت تو دکھائی دیتی رہنی چاہئے۔

اس پس منظر میں جب علماء کے سیاسی اتحاد متحدہ مجلس عمل نے انتخاب میں حصہ لیا تو انہیں صوبہ سرحد میں مکمل کامیابی کے ساتھ دوسرے تمام صوبوں میں بھی مناسب نمائندگی مل گئی۔بعض طبقات کی اس سلسلے میں تشویش اپنی جگہ بجا ہو سکتی ہے لیکن مجھے اس کامیابی کے بعض مثبت پہلو دکھائی دیتے ہیں۔مثلاً ایک مثبت پہلو تو یہی ہے کہ گزشتہ دو دہائیوں سے زائد عرصہ سے شیعہ سنّی منافرت کے نتیجہ میں جو بم دھماکے ہوتے رہے ہیں اب ان کا مکمل خاتمہ ہو سکے گا۔ایک اور مثبت پہلو یہ ہے کہ عام حالات میں جذباتی تقاریر کرنے والے ہمارے دینی رہنماؤں کو اب اقتدار میں

آ کر جب مقتدر ہوتے ہوئے اپنی مجبوریوں کا اندازہ ہوگا تو ان کے سیاسی وژن میں وسعت پیدا ہوگی۔ مجھے سب سے زیادہ مثبت پہلو یہ دکھائی دے رہا ہے کہ۔۔۔۔۔۔۔۔لیکن ٹھہریئے مجھے اس مثبت پہلو کی نشاندہی سے پہلے اپنی بات کو واضح کر لینے دیجئے۔

امریکہ تیل کے جن ذخائر پر قبضہ کرنے کا خواب لے کر افغانستان پر حملہ آور ہوا تھا۔اتنی بربادی اور لوٹ مار کرنے کے باوجود اسے اپنے مشن میں کوئی بنیادی کامیابی نہیں ملی۔حامد کرزئی اور شمالی اتحاد کی حکومت کے لئے ممکن ہی نہیں ہے کہ وہاں کے حالات کو نارمل کر سکیں۔اگر وہاں حالات نارمل نہیں ہو سکتے تو تیل کی پائپ لائن بچھانے کا خواب پورا ہونا تو کیا شروع بھی نہیں ہو سکتا۔ایسی صورت میں صرف ایک ضد ہوگی جو امریکہ کو افغانستان کی جنگی دلدل میں ویت نام سے بھی زیادہ مصیبت میں پھنسا دے گی۔اگر امریکہ متحدہ مجلس عمل کے اثر رسوخ سے فائدہ اٹھانا چاہے تو نہ صرف متحدہ مجلس عمل کے ذریعے طالبان کے سارے بکھرے ہوئے حامیوں کو یکجا کر کے صلح کی صورت نکالی جا سکتی ہے بلکہ افغانستان کی تعمیرِ نو کا عمل تیزی سے شروع کر کے افغانیوں کے زخموں پر مرہم رکھا جا سکتا ہے۔اس صورت میں امریکہ کے لئے افغانستان میں امن و امان قائم کرنا آسان ہو سکتا ہے۔لیکن اس سارے عمل کے لئے امریکہ کو اپنی عالمی دھونس کے انداز میں نہیں بلکہ مکالمہ اور مفاہمت کی راہ اختیار کر کے اپنے مقاصد کو حاصل کرنا ممکن ہوگا۔اگر موجودہ عالمی منظر میں متحدہ مجلس عمل کی وجہ سے افغانستان میں بحالیِ امن کا کام شروع ہو جاتا ہے اور امریکہ جیسا ملک مکالمہ اور مفاہمت کی راہ پر آ جاتا ہے تو میرے نزدیک یہ متحدہ مجلس عمل کی کامیابی کا ایک انتہائی مثبت پہلو ہوگا۔

اگر ایسا کچھ نہیں ہوتا تو پھر وہ سب کچھ تو ہوگا ہی جس کے بارے مختلف طبقات کی طرف سے مختلف خدشات،شکوک و شبہات اور تحفظات کا اظہار کیا جا رہا ہے۔

☆☆☆



# عمران خان سے عالمِ اسلام تک

**(یہ کالم پاکستانی انتخاب کے بعد ۲۷؍اکتوبر کو لکھا گیا تاکہ اسے کسی سیاسی پارٹی کے حق میں یا مخالفت میں نہ سمجھا جائے)**

آج میں تیسری دنیا کے حوالے سے بات نہیں کروں گا بلکہ سیدھے سبھاؤ بنیادی طور پر پاکستان کے حوالے سے اور مجموعی طور پر اسلامی دنیا کے حوالے سے بات کروں گا۔اسلامی دنیا اس وقت دو بڑے بحرانوں کا شکار ہے۔ایک خود غرضی کے باعث باہمی نفاق (عدم اتحاد) اور دوسرا موثر اور باصلاحیت قیادت کا فقدان۔یہ دونوں بحران کسی بھی خطے کی کسی محدود مقامی سطح سے لے کر بڑی اسلامی سطح تک دیکھے جا سکتے ہیں۔ہماری بیشتر قیادت مصنوعی یا جعلی نوعیت کی ہے،قیادت کی طرح مصنوعی طرزِ زندگی مسلم معاشروں میں بڑی حد تک سرایت کر چکا ہے۔جب برصغیر میں مغل سلطنت کا زوال ہوا تھا تب اسی زوال کی راکھ سے سر سید احمد خان اور مولانا محمد قاسم نانوتوی جیسی شخصیات نے جنم لیا۔ان کی علمی اور سماجی قیادت نے زوال کے انتہائی نازک ایام میں روشنی کی کرن دکھائی اور برصغیر کے مسلمان پھر سے جی اٹھے۔بعض مقبوضہ عرب ممالک کو بھی یکے بعد دیگرے آزادی ملتی گئی۔آج تمام اسلامی ممالک کے مسائل گھمبیر تر ہوتے جا رہے ہیں۔اس کے دیگر بیرونی اسباب کے ساتھ چند ہمارے اپنے ہی پیدا کردہ اسباب بھی شامل ہیں۔

پاکستان کی حالیہ انتخابی مہم کے دوران جس طرح ایک دوسرے کے خلاف مقامی نوعیت کی الزام تراشی کی گئی،اس سے اسلامی معاشرے کے عدم اتفاق اور خود غرضانہ نفاق کو بخوبی سمجھا جا

سکتا ہے۔ کرکٹ سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ اس لئے کرکٹ والے عمران خان میں میرے لئے کوئی خاص کشش نہیں تھی۔ میں ان کے کینسر ہسپتال کی انسانی خدمات کو ذاتی طور پر جانتا ہوں اوراس وجہ سے ان کا معترف ہوں۔ جمائما سے ان کی شادی پر میں نے ان کے ان بیانات کو یاد کیا جن میں انہوں نے کہا تھا کہ جب بھی شادی کروں گا کسی پاکستانی لڑکی سے کروں گا۔ تب میں یہ سوچ کر اپنے آپ میں مسکرا دیا کہ یہ تو ہمارے سیاستدانوں والا کام ہوا ہے۔ بہرحال جمائما سے شادی عمران خان کا ذاتی معاملہ تھا اورانہیں اپنی پسند کے جیون ساتھی کے ساتھ شادی کرنے کا حق حاصل تھا۔ جمائما نے بے شک عمران خان سے شادی کی وجہ سے اسلام قبول کیا،لیکن اسلامی تعلیمات کے مطابق جب کوئی اسلام قبول کرنے کا اعلان کرتا ہےتو وہ مسلمان کہلاتا ہے۔

قائداعظم نے جب ایک پارسی خاتون سے شادی کی اوران خاتون نے باقاعدہ اسلام قبول کیا،تب بعض تنگ نظراور متعصب حلقوں نے نہ صرف قائداعظم کی ذات پر ناپاک حملے کئے بلکہ سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے اس شادی کو منفی رنگ دینے کی کوشش کی۔ یہی صورتحال حالیہ انتخابی مہم کے دوران عمران خان کے سلسلے میں پیش آئی۔ عمران خان کے سیاسی خیالات سے قطع نظران کے خلاف چلائی جانے والی نازیبا مہم میں ایک طرف ان کی اہلیہ جمائما کے سابقہ مذہب کے حوالے سے اشتعال انگیزی کی گئی دوسری طرف اسے مسلم لیگ ق کے خلاف یہودی سازش قرار دیا گیا۔

میرے نزدیک اس اشتعال انگیزی سے ہمارے قومی مزاج کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ اس ''کارِخیر'' سے یہ رویہ ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی دوسرے مذہب سے اگر اسلام قبول کرلے تو ہم اس کا یا اس کے متعلقین کا آگے بڑھنا برداشت نہیں کرسکتے اورفوراً اس کے سابقہ مذہب کو بنیاد بنا کر حملہ کردیتے ہیں۔ کیا ایسے کم ظرفی کے رویے سے اسلام کے فروغ میں کوئی مدد مل سکتی ہے؟ اورایسا کرنے والے خود اسلام کے خدمتگار کہلا سکتے ہیں؟

جہاں تک میں جانتا ہوں جمائما نے فلسطینیوں پر ہونے والے مظالم پر جس انداز میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا تھا،اتنی سطح تک تو ہمارے کئی اچھے بھلے دانشور بھی حقائق کا تجزیہ نہیں کرسکے تھے۔ میں نے جمائما کے مضمون سے بہت سے مخفی اسرائیلی عزائم اوران سے متعلق حقائق کا ادراک کیا۔ انہوں نے کسی سیاسی ضرورت کے تحت نہیں بلکہ فلسطین میں بڑھتی ہوئی اسرائیلی چیرہ



دستی اور عالمی بے حسی کے نتیجہ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ جمائما کے ان خیالات کی داد دی جانی چاہئے تھی۔ ایسے کسی مضمون کا عشر عشیر بھی اس پاکستانی سیاسی حلقے کی طرف سے نہیں ہوسکا جو عمران خان کے خلاف ان کی اہلیہ کو بہانہ بنا کر اور وہ بھی ناجائز طور پر نشانہ بنا گیا ہے۔ اگر اس سیاسی کھیل میں کہیں کوئی یہودی سازش دیکھی جاسکتی ہےتو وہ اتنی ہوسکتی ہے کہ اپنی ایک ارب پتی یہودی لڑکی کا اسلام قبول کرنا اور پھر صہیونی عزائم کے خلاف مضامین لکھنا یہودیوں کو اچھا نہیں لگا اور انہوں نے الیکشن کے بہانے جمائما اور عمران کے خلاف مہم چلانے والوں کی سرپرستی کی۔ اگرچہ ایسا بھی نہیں ہوا ہوگا۔ تاہم اگر امکان کی بات ہےتو یہ بات زیادہ قرین قیاس ہے۔ وگرنہ مسلم لیگ ق کے خلاف یہودیوں کو کسی مہم چلانے کی کیا ضرورت ہے۔ اس وقت امریکی صدر اسرائیل کے ''سپوکس مین'' کی پھبتی کی حد تک یہودیوں کے تابع فرمان ہیں۔۔۔ جنرل پرویز مشرف امریکہ کے تابعدار ہیں اور مسلم لیگ ق جنرل پرویز مشرف کی تابع مہمل۔ اپنے کسی تابع کے،تابع کے ''تابع مہمل'' کے لئے یہودیوں کو اتنا سرمایہ لگانے کی ضرورت کیوں پیش آنے لگی؟

عمران خان کے خلاف چلائی جانے والی ایک مہم تو یہی تھی جو آن دی ریکارڈ رہی۔ دوسری مہم گمنام فحش پوسٹرز کی صورت میں سامنے آئی۔ بحیثیت ادیب میں جانتا ہوں کہ جعلی،مصنوعی اور چور قسم کے رائٹرز کسی اوریجنل شاعر اور ادیب کے مقابلہ میں ایسے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں۔ اپنی دانست میں خوش ہوتے ہیں کہ شاید ہم نے کوئی بڑا تیر مارلیا ہےلیکن کسی کو کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ ایسے بیہودہ رویوں کا نشانہ بننے کے باوجود غالبؔ جیسا بڑا شاعر بھی بڑا ہی رہا اوراُن بدبخت مخالفوں کا نام ادب میں صرف اس حد تک رہ گیا کہ انہیں اس حوالے سے یاد کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ غالبؔ کے خلاف بدزبانی کی فلاں حد تک گئے تھے۔ سیاست میں ایسے رویے کا فروغ پانا نہ وطنِ عزیز کے لئے مفید ہے نہ عالمِ اسلام کے لئے سودمند۔ اس رویے سے صرف قوم کے اخلاقی زوال کی انتہا کی نشاندہی ہوتی ہے۔ عمران خان کے خلاف جو گمنام گندگی اچھالی گئی اس سے عمران خان کا کچھ نہیں بگڑا۔۔۔ بس چھپے ہوئے اور ظاہر کے سارے گندہ ذہن لوگ مزید ظاہر ہوگئے ہیں اور قوم کی قیادت بھی اب غالباً یہی لوگ کرنے جارہے ہیں۔

کتنا اچھا ہو کہ مسلم لیگ ق کے قائدین اور ان کے ساتھی کسی سیاسی غرض سے بالاتر ہو کر اپنے بعض افراد کی ان حرکات پر نہ صرف عمران خان سے معذرت کریں بلکہ جمائما کے دل

میں اس ساری مہم سے جو دکھ پیدا ہوا ہے اس کی تلافی کریں۔شاید اس طرح ان کے طرزِ عمل سے ملک میں مریضانہ سیاسی رویوں کی روک تھام ہو سکے اور قوم مزید اخلاقی زوال سے بچ سکے۔

عمران خان کے خلاف ہونے والی اس گندی مہم کے حوالے سے ہماری سیاست کی اخلاقی حالت کا مجموعی طور پر اندازہ کیا جا سکتا ہے۔اس کے باوجود یہی لوگ اب ایوانِ اقتدار میں داخل ہو رہے ہیں تو وطنِ عزیز کا اللہ ہی حافظ ہے۔اس مثال سے نہ صرف ہمارے قومی نفاق اور اخلاقی زوال کا اندازہ کیا جا سکتا ہے بلکہ اسی مثال سے ہمارے ہاں موثر اور باصلاحیت قیادت کے فقدان کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔سرسید احمد خان سے قائداعظم محمد علی جناح تک برصغیر کو جیسی مسلم قیادت میسر آئی، وہ کوئی خاص خدائی عنایت ہی تھی۔اس کے بعد نئے بین الاقوامی حالات کے تناظر میں اسلامی بلاک کی قیادت کرنے والے چند اہم لیڈر ابھرے۔ذوالفقار علی بھٹو، شاہ فیصل اور کرنل قذافی اسی قبیل کے لیڈر تھے۔بھٹو اور شاہ فیصل کے خلاف جو عالمی سازش رچائی گئی وہ اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی۔اور کرنل قذافی کو جیتے جی جس طرح مار دیا گیا وہ ظاہر ہے۔اب تو پوری اسلامی دنیا میں ایسی کسی قیادت کا فقدان ہے جو عالمی صورتحال کے مطابق آگے قدم بڑھا سکے۔اسلامی دنیا کو اس دلدل سے نکال سکے جس میں صہیونی سازشوں سے پورا عالمِ اسلام دھنستا چلا جا رہا ہے۔موجودہ حالات میں تو کوئی سرسید احمد خان اور مولانا محمد قاسم نانوتوی بھی موثر کردار ادا کرنے سے قاصر رہیں گے۔اس وقت عالمِ اسلام کو بین الاقوامی سطح کے بڑے اسلامی لیڈروں کی ضرورت ہے۔مہاتیر محمد اور سعودی شہزادہ عبداللہ میں ایسی لیڈرشپ کے امکانات تو ملتے ہیں لیکن جب قوم کی حالت ہی ناگفتہ بہ ہو تو ایسی قیادت بھی کیا کر سکے گی؟

مجھے لگتا ہے عمران خان کے خلاف چلائی جانے والی گندی مہم ہمارے جس قومی اخلاقی زوال کی نشانی ہے، وہ زوال پورے عالم اسلام میں نفوذ کر چکا ہے۔عالمِ اسلام عمومی طور پر اپنی بیشتر سماجی اور سیاسی سطحوں پر اس وقت انتہائی خودغرضی اور مفاد پرستی کی دلدل میں دھنس چکا ہے، اس دلدل سے بچ نکلنے والوں کے لئے آگے امریکی صدر بش اور ان کے مشیروں کی بنائی ہوئی دلدل موجود ہے۔

☆☆☆



# امریکی رویوں میں تبدیلی کے آثار

میں نے اپنے گزشتہ سے پہلے کالم (متحدہ مجلس عمل کی کامیابی، امریکہ اور افغانستان (on line at www.urdustan.net) میں متحدہ مجلس عمل کی ۱۰/اکتوبر ۲۰۰۲ء کے انتخابات میں کامیابی کے حوالے سے اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔اب تک متعدد صحافیوں اور دانشوروں نے متحدہ مجلس عمل کی کامیابی پر اپنی اپنی رائے دی ہے۔اس سلسلہ میں ایسے لکھنے والوں کو تین مختلف طبقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ایسے حضرات جنہوں نے متحدہ مجلس عمل کی کامیابی پر ایسا ردِعمل ظاہر کیا جیسے انہیں پاکستان پر حکومت کرنے کا مینڈیٹ مل گیا ہے۔

۲۔ایسے حضرات جن کے ردِعمل سے ایسے لگا جیسے پاکستان کی سلامتی اور بقا کو سارا خطرہ ہی دینی جماعتوں سے ہے۔

۳۔ایسے حضرات جنہوں نے سارے حقائق کا غیر جانبداری سے اور ایمانداری سے جائزہ لے کر ملکی صورتحال کو سمجھنے کی کوشش کی۔

ہر لکھنے والے اور تجزیہ کار کا اپنا ذہن ہوتا ہے اور وہ اس کے مطابق اپنی رائے پیش کرتا ہے۔میں نے اس سلسلے میں جو اہم نکتہ پیش کیا تھا مجھے حیرت ہے کہ اس سارے عرصہ میں کسی اور ثقہ لکھنے

والے کا اس نکتہ کی طرف دھیان ہی نہیں گیا۔شاید کسی نے اس حدتک ہو جانے کے امکان کو محسوس نہیں کیا۔بہتر ہوگا کہ پہلے میرے کالم کا وہ اہم حصہ دیکھ لیں،جس کی بنیاد پر میں نے اپنے اُس کالم کا ذیلی عنوان ''متحدہ مجلس عمل کی کامیابی،امریکہ اور افغانستان'' رکھا تھا۔میں نے لکھا تھا:

''امریکہ تیل کے جن ذخائر پر قبضہ کرنے کا خواب لے کر افغانستان پر حملہ آور ہوا تھا۔اتنی بربادی اور لوٹ مار کرنے کے باوجود اسے اپنے مشن میں کوئی بنیادی کامیابی نہیں ملی۔حامد کرزئی اور شمالی اتحاد کی حکومت کے لئے ممکن ہی نہیں ہے کہ وہاں کے حالات کو نارمل کر سکیں۔اگر وہاں حالات نارمل نہیں ہو سکتے تو تیل کی پائپ لائن بچھانے کا خواب پورا ہونا تو کیا شروع بھی نہیں ہو سکتا۔ایسی صورت میں صرف ایک ضد ہو گی جو امریکہ کو افغانستان کی جنگی دلدل میں ویت نام سے بھی زیادہ مصیبت میں پھنسا دے گی۔اگر امریکہ متحدہ مجلس عمل کے اثر رسوخ سے فائدہ اٹھانا چاہے تو نہ صرف متحدہ مجلس عمل کے ذریعے طالبان کے سارے بکھرے ہوئے حامیوں کو یکجا کر کے صلح کی صورت نکالی جا سکتی ہے بلکہ افغانستان کی تعمیر نو کا عمل تیزی سے شروع کر کے افغانیوں کے زخموں پر مرہم رکھا جا سکتا ہے۔اس صورت میں امریکہ کے لئے افغانستان میں امن وامان قائم کرنا آسان ہو سکتا ہے۔لیکن اس سارے عمل کے لئے امریکہ کو اپنی عالمی دھونس کے انداز میں نہیں بلکہ مکالمہ اور مفاہمت کی راہ اختیار کر کے اپنے مقاصد کو حاصل کرنا ممکن ہوگا۔اگر موجودہ عالمی منظر میں متحدہ مجلس عمل کی وجہ سے افغانستان میں بحالیِ امن کا کام شروع ہو جاتا ہے اور امریکہ جیسا ملک مکالمہ اور مفاہمت کی راہ پر آ جاتا ہے تو میرے نزدیک یہ متحدہ مجلس عمل کی کامیابی کا ایک انتہائی مثبت پہلو ہوگا۔''

اس دوران پاکستان میں حکومت سازی کے مقامی مفاداتی سلسلے سے قطع نظر۔۔۔۔چند ایسے اہم واقعات ہوئے ہیں جن سے میرے اس تجزیے اور اندازے کی توثیق ہوتی ہے۔متحدہ مجلس عمل کے اہم قائدین نے عالمی سطح پر اپنے امیج کو بہتر بنانے کے لئے موثر ڈپلومیٹک اقدام کئے ہیں۔اسلام آباد میں امریکہ سے لے کر بھارت تک اہم مما لک کے سفارت کاروں کے ساتھ گفتگو اور ان کے سوالوں کے نپے تلے جواب دینا۔۔۔پھر متحدہ مجلس عمل کی جانب سے امریکہ کے خدشات کو دور کرنے کے لئے بعض اہم وضاحتیں کرنا اور اپنے موثر سیاسی کردار کو مثبت انداز میں ابھارنا۔۔۔ایسے واقعات ہیں جن کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت پاکستان کے



تینوں بڑے سیاسی گروپ امریکہ کے ساتھ دوستی کے لئے بیتاب ہیں۔چونکہ یہاں میں متحدہ مجلس عمل کے مخصوص سیاسی کردار کی بات کر رہا ہوں اس لئے یہاں پی پی پی اور مسلم لیگ ق سے صرفِ نظر کر رہا ہوں۔

بعض پاکستانی طبقات کی طرف سے متحدہ مجلس عمل کی کامیابی کو ہوّا بنا کر پیش کیا جا رہا تھا اس کے باوجود امریکہ نے اس کامیابی کو تشویش کی نظروں سے نہیں دیکھا۔اس دوران امریکی تھنک ٹینک اپنے تجزیوں اور غور وخوض میں مشغول رہے اور اب آج ۹/اکتوبر کے روزنامہ ''جنگ'' کے انٹرنیٹ ایڈیشن نے ایک اہم خبر شائع کی ہے۔واشنگٹن پوسٹ کے حوالے سے دی گئی ''جنگ'' کی اس خبر کے مطابق امریکی مسلح افواج کے چیئرمین جوائنٹ چیفس آف اسٹاف رچرڈ بی مائرز(Richard B. Myers) نے بروکنگ انسٹی ٹیوٹ نامی معروف اور اہم امریکی تھنک ٹینک کے ایک حالیہ اجلاس میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔یہاں ''جنگ'' کی خبر کا بڑا اور اہم حصہ درج کر دینا زیادہ مناسب ہوگا۔

## ''افغان حکمت عملی پر امریکی کمان اور پاکستانی علماء کے موقف میں یکسانیت

واشنگٹن۔۔۔پاکستان کے انتخابات میں کامیاب ہونے والے علماء اور امریکی فوجی ہائی کمان مذاکرات کے بغیر افغان حکمت عملی پر یکساں موقف اختیار کر رہے ہیں۔امریکی مسلح افواج کے چیئرمین جوائنٹ چیفس آف اسٹاف رچرڈ بی مائرز Richard B. Myers نے امریکا کے ایک اہم تھنک ٹینک بروکنگ انسٹی ٹیوٹ کے حالیہ اجلاس میں اس خیال کا اظہار کیا القاعدہ اور طالبان کے جنگجو ہمارے حربے سمجھ کر پھرتی سے ان کا توڑ کر رہے ہیں۔افغانستان میں فوجی آپریشن کے بجائے تعمیر نو پر زور دینے کی حکمت عملی زیادہ موثر ہوگی۔خیال کیا جاتا ہے کہ پاکستان کی مرکزی اور صوبائی حکومتوں میں متحدہ مجلس عمل کی موجودگی سے القاعدہ کے ہمدردوں کو افغانستان کی تعمیر نو پر قائل کرنے میں مدد ملے گی۔واشنگٹن پوسٹ کے مطابق امریکی جنرل نے اس خیال کا اظہار کیا کہ افغانستان میں اپنی ترجیحات تبدیل کرنے کا وقت آ گیا ہے۔اور القاعدہ اور طالبان جنگجوؤں کے خلاف فوجی آپریشنوں کے بجائے اب افغانستان کی تعمیر نو پر توجہ دینی چاہئے۔جنرل مائر نے کہا القاعدہ اور طالبان کے دہشت گردوں پر ہماری گرفت کمزور پڑ رہی

ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ وہ ہمارے حربوں کے بارے میں بہت کچھ جان چکے ہیں جبکہ القاعدہ کے خطرے کا جواب دینے میں ہم بہت سست رہے ہیں۔حملوں اور دہشت گردوں کی تلاش کی حکمت عملی کو افغانستان کی تعمیرنو کی حکمت عملی میں تبدیل کرنا انتہائی اہم اور مفید ہوگا۔خیال کیا جاتا ہے کہ حکمت عملی کی اس تبدیلی سے پاکستان کی مذہبی جماعتوں اور امریکہ کے درمیان تلخی کی ایک بڑی وجہ ختم ہو جائے گی۔امریکی دفتر خارجہ نے ایم ایم اے کی کامیابی پر ردعمل ظاہر کرنے سے جو انکار کیا تھا اس کی ایک وجہ فوجی کمان کے رویے میں تبدیلی بھی ہوسکتی ہے۔''

اگرچہ امریکی نیتوں کا پورا ادراک کرنا ممکن نہیں ہے تاہم مجھے ایسا لگتا ہے کہ امریکی حکام کو احساس ہو گیا ہے کہ جن مقاصد کی خاطر انہوں نے افغانستان پر حملہ کیا تھا، وہ مقاصد ابھی تک حصول کی منزل سے بہت دور ہیں۔اور اس کے بجائے افغانستان میں انہیں ایک ایسے نئے ویت نام کے آثار بھی دکھائی دینے لگے ہیں، جو پہلے ویت نام سے کہیں زیادہ نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے۔اسی لئے انہیں پاکستان کی متحدہ مجلس عمل کے ذریعے افغانستان میں جنگ جوئی کی بجائے ''تعمیرنو'' کی پالیسی کا خیال آ گیا ہے ۔ اسے امریکی سوچ میں اچھی تبدیلی کے آثار سمجھنا چاہئے۔ مجھے خوشی ہے کہ میں نے چند ہفتے پہلے اپنے تجزیہ میں جو اندازہ کیا تھا فکری رنگ میں وقت نے اسے بڑی حد تک درست ثابت کر دیا ہے۔خدا کرے کہ فکری سطح سے بڑھ کر عملی سطح پر بھی اب ایسا سب کچھ ہو جائے۔افغانستان کے ساتھ عراق کے معاملہ میں بھی بین الاقوامی دباؤ کے باعث ہی سہی لیکن امریکی رویے میں تبدیلی کے آثار ظاہر ہو رہے ہیں۔صدر بُش اگر امریکی رویوں میں مثبت تبدیلیوں کی طرف عملی طور پر بھی مائل ہو سکے تو ان کی یہ شکایت از خود ختم ہو جائے گی کہ دنیا کے زیادہ تر لوگ امریکہ سے نفرت کیوں کرتے ہیں؟ بلکہ مزید بہتر اور متوازن و منصفانہ انداز اپنانے سے انہیں شاید پھر اس بات پر حیرت ہو کہ دنیا امریکہ سے اتنی محبت کیسے کرنے لگی ہے؟

☆☆☆



# سارک یونین کا قیام، وقت کی ضرورت

پاکستان کے جنرل پرویز مشرف جن اعلیٰ آدرشوں کے دعووں کے ساتھ اقتدار پر آئے تھے،ان کی بنیاد پر مجھ جیسے کئی لوگ نیک نیتی کے ساتھ ان سے بہت ساری توقعات وابستہ کر بیٹھے۔اپنی ان نیک توقعات کے باعث جنرل پرویز مشرف کو قوم کا نجات دہندہ اور مخلص رہنما سمجھ بیٹھے۔لیکن پاکستان کے حالیہ ''سیاسی عمل'' اور اس کے نتیجہ میں ''جمہوریت کی بحالی'' اتنی افسوسناک اور شرمناک ہے کہ جنرل پرویز مشرف کی ''کرپشن'' کے خلاف ساری تقریریں اور باتیں ایک مذاق معلوم ہونے لگی ہیں اور ''گڈ گورننس'' کے دعوے محض ''سیاسی بیان'' ثابت ہو گئے ہیں۔ مجھے پاکستان کی حالیہ ''جمہوریت کی بحالی'' پر مزید کچھ نہیں کہنا کہ میرے لئے یہ کہانی بہت تکلیف دہ ہو جائے گی۔اگرچہ میاں نواز شریف کی حکومت کوئی پاک پوتر حکومت نہیں تھی۔ بلکہ وہ خود جنرل ضیاء الحق جیسے فوجی آمر کی پیدا کردہ ''سیاسی حکومت'' کا ثمر تھے۔لیکن یہ حقیقت ہے کہ فوجیوں کے ساختہ حکمران بھی ایک حد تک جانے کے بعد بالآخر عوام کے لئے کچھ نہ کچھ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔جب تک میاں نواز شریف میں ایسی سوچ توانا ہوئی تب تک وہ اپنی بعض

غلطیوں کے باعث اقتدار سے محروم ہوگئے۔ بے نظیر بھٹو کو بے شک دو بار اقتدار میں آنے دیا گیا لیکن فوج اور ایجنسیوں نے انہیں ایک طرح سے انہیں مجبور محض بنائے رکھا۔خود میاں نواز شریف بھی انہیں ''غیبی اشاروں'' پر بے نظیر بھٹو کو زچ کرنے پر تلے رہے۔ بہر حال خوش امید لوگوں کی تمام تر خوش امیدیاں ''خوش فہمیاں'' بن کر ظاہر ہو چکی ہیں۔فوجی جرنیل اپنے پرانے فارمولے پر عمل پیرا ہیں۔ وہی کھیل جو ایوب خان سے لے کر جنرل ضیا تک کھیلا گیا، اب پھر نئے رنگ ڈھنگ کے ساتھ جاری ہے۔ایسی تکلیف دہ صورتحال میں پھر انتہا پسند سیاسی حلقوں کی یہ الزام تراشی دل پر کچھ اثر کرنے لگتی ہے کہ ''پاکستان کو کسی فوجی جرنیل نے نہیں، بلکہ سیاسی شخصیات نے بنایا تھا اور اس ملک کو جب بھی توڑا ہے یا برباد کیا ہے تو فوجی جرنیلوں نے ہی توڑا اور برباد کیا ہے۔اگر بعض سیاستدان اس لوٹ مار میں شامل ہوئے تو ان کو بھی فوجی جرنیلوں نے ہی ایسا کرنے کا اشارا دیا۔ سیاستدانوں کو بھی فوجی جرنیلوں نے ہی کرپٹ کیا ہے۔''

پاکستان کے عوام کے حقیقی مسائل کو دیکھا جائے تو عوام کی بہت بڑی اکثریت کا مسئلہ تعلیم کا حصول، اچھا علاج معالجہ، غربت کا خاتمہ اور دیگر بنیادی انسانی ضروریات ہیں۔عوام کو غربت، بھوک، بیماریوں اور جہالت سے جنگ کرنا ہے اور ان ساری مصیبتوں سے نجات پانا ہے۔کیا فوجی جرنیلوں نے اپنے زائد از ستائیس سالہ دور اقتدار میں عوام کے ان مسائل کے حل کے لئے کوئی ٹھوس قدم اٹھایا؟ انڈیا اور پاکستان کی دشمنی کو ہوا دے کر فوج کے مقتدر حلقوں نے بھلے اپنی جائیدادیں اور جاگیریں بنالی ہوں لیکن غریب پاکستانی تو غریب سے غریب تر ہوتا جارہا ہے۔انڈیا کے ساتھ خوامخواہ کی دشمنی سے ہمارا کوئی مسئلہ حل نہیں ہوا ہے، الٹا ہمارے عوام کے مسائل اور دکھوں میں اضافہ ہوا ہے۔کشمیر کا مسئلہ یقیناً حل ہونا چاہئے۔اس کے لئے اقوام متحدہ کی قرارداد اور شملہ معاہدہ دونوں کی رو سے کشمیری عوام کی آزادانہ رائے ہی ان کی قسمت کا فیصلہ کرے گی۔ یہی مسئلہ کشمیر کے حل کی اصل اور حقیقی بنیاد ہے۔بے شک انڈیا اس طرف آنے سے مسلسل لیت و لعل سے کام لے رہا ہے، لیکن اب تو ایسے لگتا ہے کہ جیسے اس معاملے کو لٹکائے رکھنا پاکستانی جرنیلوں کی بھی ضرورت ہو۔خدا کے لئے اب اپنے عوام سے یہ کھلواڑ بند کیجئے۔اور جنوبی ایشیا میں غربت اور جہالت کے پیدا کردہ انتہا پسندانہ تعصّبات کا خاتمہ کرنے کے لئے اپنا اہم کردار ادا کریں۔ پاکستان کے موجودہ حکمرانوں اور پاکستان کی اس وقت کی صورتحال پر مجھے فی



الوقت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا۔

پاکستان کے ان اندرونی امور سے ہٹ کر جنوبی ایشیا کی عمومی صورتحال بھی اس وقت انتہائی نازک مرحلوں سے گزر رہی ہے۔ نیپال کے شاہی خاندان کا قتل، سری لنکا میں تامل علیحدگی پسندوں کی طویل خانہ جنگی، کشمیری عوام کی جدو جہد آزادی، ایسے امور ہیں جن سے صرف نظر کرنا حقائق کو چھپانے کے مترادف ہے۔تاہم اگر وقتی طور پر اس خطہ کے تمام اہم مسائل کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو پاکستان اور انڈیا کی کشیدگی ہی سارے خطہ کے امن کو برباد کرنے کا موجب بن سکتی ہے۔ میں نے اپنے کالم (ذیلی عنوان ''انڈو پاک مسائل اور مستقبل'') میں انڈیا اور پاکستان کے عوام کے اصل دکھوں، مصائب اور ضروریات کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ان ضروریات کو پورا کرنے اور دکھوں اور مصائب کو دور کرنے کے لئے مشترکہ جدو جہد کی ضرورت ہے۔اس کے لئے میں نے خطہ کے دیرینہ مسائل کے ایماندارانہ حل کے ساتھ وسیع اشتراک عمل کی طرف توجہ دلائی تھی۔ یورپی یونین کی طرز پر سارک یونین کا قیام ہی ہمارے سارے عوام کے دکھوں کا علاج ہے اور یہی وقت کی اہم ضرورت ہے۔میرے لئے یہ اہم نکتہ ابھی بھی ایک خواب جیسا ہے، لیکن مجھے داخلی طور پر تحریک ہوئی ہے کہ میں اس بارے میں ایک بار پھر اور قدرے وضاحت کے ساتھ پاکستان اور بھارت کے مقتدر سیاسی حلقوں اور موثر صائب الرائے دانشوروں کو اس طرف توجہ دلاؤں۔ میرا مذکورہ بالا کالم القمر آن لائن ڈاٹ کام پر بھی موجود ہے اور اردوستان ڈاٹ کام پر تو 22 جولائی 2002ء کی تاریخ کے ساتھ آن لائن موجود ہے۔لگ بھگ پانچ ماہ کے بعد پاکستان کی ایک معتبر اور اہم سیاستدان بے نظیر بھٹو نے اس بات کو اپنے ایک آرٹیکل میں اپنے انداز سے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:''ہم کو 'سارک' کو مضبوط کرنا چاہئے کیونکہ کشمیر کی وجہ سے سارک اپنا کردار ادا نہیں کر پا رہا۔آہستہ آہستہ سارک کو کوشش کر کے یورپین کامن مارکیٹ کی طرز پر بڑھانا چاہئے کیونکہ اس خطہ کے دوارب لوگوں کا مستقبل خطہ کے امن اور دوستی میں مضمر ہے'' (بحوالہ مضمون ''ہماری خارجہ پالیسی اور خطہ کی صورتحال'' از بے نظیر بھٹو۔ جنگ۔انٹرنیٹ ایڈیشن 25 دسمبر 2002ء)

مجھے خوشی ہے کہ اپنی بعض ترجیحات کے باوجود (جو کہ حالات کے دباؤ کا نتیجہ ہیں) ملک کی سب سے اہم سیاسی شخصیت نے بھی سارک ممالک کے اتحاد کا احساس کیا ہے۔ضرورت اس امر کی ہے

کہ اس تصور کو اب انڈیا کے اہم سیاستدانوں اور دانشوروں تک بھی بڑھایا جانا چاہئے اور پاکستانی ارباب اختیار کو بھی اس پر بہت سنجیدگی سے اور عملیت پسندی کے حوالے سے غور کرنا چاہئے۔

مجھے اندازہ ہے کہ ''اکھنڈ بھارت'' کا خواب دیکھنے والے انتہا پسند ہندو سیاستدان بھی اس تصور کی اتنی ہی مخالفت کریں گے، جتنی پاکستان کے وہ عناصر کریں گے جو دل سے یہ چاہتے ہی نہیں کہ پاکستان اور انڈیا کی دشمنی ختم ہو۔ تاہم یہاں میں انڈیا کے انتہا پسند ہندوؤں کے لئے اپنے طور پر کچھ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ بھارت کے انتہا پسند ہندوؤں کا مسلمانوں کے خلاف سارا غیض وغضب اپنی جگہ۔۔۔ اپنے ہاتھوں سے تاریخ کو مسخ کرنے کے بعد سابقہ مسلم حکمرانوں پر لگائے جانے والے ان کے سارے الزامات بھی برحق سہی۔۔۔۔ سوال یہ ہے کہ اگر آج کے سارے عالمِ اسلام کے حکمران خود اپنے عوام کے لئے کوئی بڑا منصفانہ اور فلاحی نظام نہیں لا سکے تو سابقہ صدیوں کے برصغیر کے مسلم حکمرانوں کے کسی سچے، جھوٹے اور جائز، ناجائز فعل کا ذمہ دار موجودہ مسلمان عوام کو کیونکر گردانا جا سکتا ہے؟ اور تاریخ کے نام پر ظلم اور انتہا پسندی کا کھیل کب تک جاری رکھا جا سکے گا؟ سابقہ مسلم حکمرانوں کے کسی فرضی یا حقیقی کردار کو بنیاد بنا کر انتہا پسند ہندوتوا کی سیاست بالآخر نہ صرف ہندو دھرم کے لئے شدید نقصان کا موجب بنے گی بلکہ پورے خطے کی تباہی کا موجب بنے گی۔

ہندو انتہا پسندوں کے سیاسی کھیل کے سلسلہ میں بڑی حد تک ہمارے پاکستان کے مذہبی اسلامی انتہا پسند بھی ذمہ دار ہیں۔ دراصل پاکستان میں مذہبی انتہا پسندی کی روش جیسے جیسے فروغ پاتی گئی ویسے ویسے ہی انڈیا میں ہندوتوا کی لہر توانا ہوتی گئی۔ اس کے لئے کسی طویل تاریخ کو کھنگالنے کی ضرورت بھی نہیں۔ ۱۹۷۰ء کے بعد پاکستان کے اسلامی انتہا پسند بتدریج طاقتور ہوتے گئے۔ افغانستان میں سوویت یونین کے خلاف امریکی سرپرستی میں ہونے والے ''جہاد'' کے بعد پاکستان کے اسلامی انتہا پسند طبقے مالی، سیاسی اور عسکری ہر لحاظ سے مضبوط ہو گئے۔ اور ان کے ''دینی حمیت کے جذبوں'' کی تقلید کرتے ہوئے انڈیا میں ہندو انتہا پسند بھی ویسے ہی اپنے دھرم کے معاملے میں اپنی ''حمیت'' کا اظہار کرنے لگے۔ اس لئے میرے نزدیک برصغیر کے سابقہ اسلامی حکمرانوں کے بجائے خود آج کے پاکستان کے انتہا پسند اسلامی حلقے، ہندوستان میں ہندوتوا لہر کو توانا کرنے میں زیادہ ذمہ دار ہیں۔ اگر سیکولر انڈیا کے ہمسایہ میں کوئی اپنے دین سے



وابستگی میں ''غیرت، حمیت'' وغیرہ اوصاف کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس پر ناز کر رہا ہے تو پھر انڈیا کے ہندو انتہا پسندوں کو بھی ویسے ہی اپنے دھرم کے معاملہ میں ''غیرت وحمیت'' کا اظہار کرنے اور اپنے دھرم پر ناز کرنے سے کیونکر روکا جا سکتا ہے؟۔۔۔ لیکن یہی تو وہ فساد ہے جو ہمیں ہمارے اصل مسائل سے ہٹا کر بھٹکا رہا ہے۔

اس وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ جس طرح امریکی چالوں کے باوجود شمالی کوریا اور جنوبی کوریا اپنے اشتراک عمل میں وسعت پیدا کرنے کے لئے کوشاں ہیں، اسی طرح محض امریکی مفادات کی تکمیل کرنے کے بجائے سارک ممالک کو بالعموم اور پاکستان اور انڈیا کو بالخصوص مل بیٹھ کر نہ صرف اپنے مسائل کو حل کرنا چاہئے بلکہ اشتراک عمل کا ایسا منصوبہ وضع کرنا چاہئے جس میں سارک ممالک کو یورپی یونین کی طرز پر فعال اور موثر بنایا جا سکے۔ نیک نیت کے ساتھ قدم آگے بڑھایا جائے تو نہ صرف اس سے دلوں میں سرایت کر جانے والے بہت سارے زہریلے تعصّبات کا تدریجاً خاتمہ ہو گا بلکہ اس سے پورے خطہ میں امن واستحکام قائم ہو سکے گا۔ فوجی اخراجات میں زبردست کمی کے ساتھ اس خطہ کے ممالک کو غربت کے خاتمہ کے لئے کسی بیرونی قرض یا امداد کی ضرورت نہیں رہے گی۔

سارک یونین کو یورپی یونین کی طرز پر متحرک اور موثر بنانا ہی اس خطے کے عوام کے مفاد میں ہے۔ اس ''زمینی حقیقت'' کا ادراک کر لینے والے ہی اس خطہ کے عوام کے دکھوں اور مصائب کا خاتمہ کر سکیں گے، جو قائدین اس حقیقت کے شعور سے محروم رہیں گے وہ اپنے ملک کے ساتھ برصغیر کے سارے عوام کو بھی دکھوں میں مبتلا رکھنے والے قائدین ہوں گے۔

سارک یونین آج کے وقت کی ضرورت ہے!

☆☆☆

# عراق پر اینگلو امریکن حملہ

**" We are against this War
Mr.Bush Shame on you!"
(Micheal Moore)**

اقوام متحدہ میں کھلی سفارتی ناکامی کے بعد ۲۰ مارچ ۲۰۰۳ء کو امریکہ اور انگلینڈ نے مل کر عراق پر حملہ کر دیا ہے۔عراق کو بارہ سال سے سخت ترین بین الاقوامی پابندیوں سے گزارنے کے بعد، اور حال ہی میں اقوام متحدہ کے اسلحہ انسپکٹرز کی طرف سے ہر طرح کی تلاشیاں لے کر عراق کو بالکل نہتا کر دینے کے بعد امریکہ کی بہادر افواج نے عراق پر حملہ کر دیا ہے۔اس سلسلہ میں ۲۰ مارچ سے لے کر اب تک مختلف اردو اخبارات اور ٹی وی چینلز پر ممتاز صحافیوں اور دانشوروں کی آراء اور تجزیوں سے باخبر رہنے کا موقعہ ملا۔خود کچھ بھی لکھنے کو دل نہیں کر رہا تھا۔میں ذہنی اور قلبی طور پر شدید جذباتی کیفیات سے گزر رہا تھا، وہ کیفیات اپنے اثرات تو مرتب کر رہی ہیں لیکن اب ذہنی ہیجان کی حالت سے کچھ باہر آ گیا ہوں۔اس لئے آج ۲۹ مارچ کو اس مسئلہ کے بارے میں کچھ عرض کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔عراق پر امریکی حملہ کی جس انداز میں دنیا بھر نے شدید مذمت کی ہے اور اس پر جس طرح بلا امتیاز ہر طبقہ نے جارح حملہ آوروں کے خلاف شدید غم و غصہ اور نفرت کا اظہار کیا ہے اس سے ظاہر ہے کہ عالمی ضمیر نہ صرف زندہ ہے بلکہ جھوٹے پروپیگنڈہ کو پوری طرح رد کرتا ہے۔اس معاملہ میں میرے جذبات بھی باقی ساری دنیا کے جذبات ہی کا حصہ ہیں۔اس عرصہ میں میں نے ٹی وی اور اخبارات پر جن دانشوروں کے تجزیوں اور تاثرات سے فیض اٹھایا ہے ان میں سے بعض کے ہاں مجھے ایسا لگا ہے کہ وہ پورے منظر کو اس کے سارے



زاویوں سے دیکھنے کے بجائے صرف کسی ایک ہی زاویے سے دیکھ رہے ہیں اور اس کے نتیجہ میں دوسرے زاویوں کو نظر انداز کر رہے ہیں یا رد کر رہے ہیں۔اس سلسلہ میں جو مختلف اور متضاد آراء سامنے آئی ہیں ان کا نقشہ کچھ یوں بنتا ہے۔

۱۔افغانستان سے عراق تک امریکی کاروائیاں تہذیبوں کے ٹکراؤ کی تھیوری کے عین مطابق ہیں۔ٹکراؤ شروع ہو چکا ہے۔(نہیں ایسا کوئی ٹکراؤ نہیں ہو رہا)۔

۲۔یہ صلیبی جنگ شروع کرنے کا اعلان امریکی صدر بُش نے کیا تھا اور واقعی یہ اسلام کے خلاف جنگ ہے۔(نہیں یہ صلیبی جنگ نہیں ہے)

۳۔یہ سارا امریکی کھیل تیل کے بڑے ذخائر پر قبضہ کرنے کی سازش کا حصہ ہے۔(تیل کے ذخائر رکھنے والے بیشتر بڑے ممالک پہلے ہی امریکی اشارے پر چلتے ہیں۔اس لئے امریکہ کو محض تیل کے لئے خون خرابہ کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔یہ تیل کا کھیل نہیں ہے)

۴۔عرب خطے پر اسرائیل کے تحفظ اور بالا دستی کے لئے یہ حملے کئے جا رہے ہیں۔(نہیں جی اسرائیل کو پہلے ہی خطے پر بالا دستی حاصل ہے اور عربوں سے اس کی سلامتی کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے۔عربوں میں اتنا دَم خم ہی نہیں ہے)

۵۔امریکہ ایسی کاروائیوں سے دنیا کی دوسری اہم طاقتوں پر اپنی دھاک بٹھانا چاہتا ہے۔(ایسا لگتا نہیں، اس کی ضرورت بھی نہ تھی۔)

یہ میں نے مختلف زاویہ نگاہ رکھنے والوں کے موقف کو اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے۔میری ذاتی رائے یہ ہے کہ امریکہ کا کوئی بھی اقدام صرف ایک زاویے کا حامل نہیں ہوتا۔وہ کثیر المقاصد زاویوں کا حامل ہوتا ہے۔افغانستان سے عراق تک امریکی جارحیت مذکورہ سارے زاویوں کو مد نظر رکھ کر کی گئی ہے۔

تہذیبوں کے ٹکراؤ کا امریکی مصنف عراقی جنگ کے آغاز کے ساتھ ہی ایک امریکی ریڈیو پر اس حد تک بات کرتا ہے کہ ہمارا مسئلہ صرف بنیاد پرست اور انتہا پسند مسلمان نہیں ہیں بلکہ سارے مسلمان ہیں۔تو اس کا مطلب ہے کہ امریکہ کے بُش گروپ نے واقعتاً تہذیبوں کی جنگ چھیڑی ہے۔اسی پس منظر میں جب امریکی صدر بُش کے ''صلیبی جنگوں کے آغاز'' کے اعلان کو سامنے رکھا جائے تو اس کے بعد پیش آنے والے حالات کے پس منظر میں اسے محض اضطراری

بیان کہنا مشکل ہو جاتا ہے۔اب جب کہ عراق پر حملہ کے بعد امریکی ایوان صدر کے سب سے اہم اور قابلِ قدر پادری ڈاکٹر فرینکلن گراہم کی قیادت میں عراق میں مسیحیت کی تبلیغ کے لئے مشنری دستے تیار کئے جانے لگے ہیں تو اس جنگ کے صلیبی پہلو کو رد کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔(یاد رہے کہ فرینکلن گراہم مشہور امریکی پادری ڈاکٹر بلی گراہم کے بیٹے ہیں اور اپنے اسلام دشمن بیانات کے سلسلہ میں خاصی شہرت رکھتے ہیں) اس سے ظاہر ہے کہ امریکی حکمرانوں کے دلوں اور ذہنوں کا فتور تہذیبی اور صلیبی دونوں ٹکراؤ کرنے کا تھا۔اب اسے صدر بُش اور انتہا پسند مسیحی حلقوں کی بدبختی کہا جائے یا کچھ اور کہ امریکی جارحیت کے خلاف سب سے زیادہ موثر مظاہرے اور احتجاج خود ان ممالک میں ہوئے ہیں جو عددی اکثریت کے لحاظ سے مسیحی ممالک کہلا سکتے ہیں۔یورپ سے لے کر آسٹریلیا تک ۔۔اور کینیڈا سے لے کر خود امریکہ تک انسان دوست مسیحی عوام نے مسلمانوں پر سبقت حاصل کر کے امریکی حکمرانوں کے عزائم کے خلاف عوامی ناراضی کا بے مثال نمونہ دکھا دیا ہے۔پھر خود عالمی مسیحی روحانی پیشوا پوپ جان پال نے ایک سے زائد بار امریکی جارحیت کے خلاف اپنا باضابطہ بیان دے کر صدر بُش اور ان کے دانشوروں کے دعووں کے غبارے سے ہوا نکال دی ہے۔خود جرمنی اور فرانس سمیت متعدد یورپی ممالک نے امریکی جارحیت کو سفارتی سطح پر جس طرح پسپا کیا ہے وہ خود ایک الگ داستان ہے۔

جہاں تک تیل کے ذخائر پر قبضہ کے مذموم ارادے کا تعلق ہے یہ بھی سامنے کی بات ہے۔افغانستان پر حملہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھا۔مگر ابھی تک وہاں افغان گوریلا مزاحمت کے باعث امریکہ اپنے اصل مقصد کے حصول میں کوئی پیش رفت نہیں کر سکا۔شاید اس وجہ سے بھی صدر بُش نے مناسب سمجھا کہ عراق پر حملہ کر کے ابھی اس خفت پر پردہ ڈال لیا جائے۔سابق سوویت یونین کی تیل سے مالا مال ریاستوں کا تیل حاصل کرنے کا امریکی منصوبہ ابھی تک آئل مافیا کا منہ چڑا رہا ہے۔اوپر سے عراق پر حملہ امریکہ کے لئے مزید رسوائی کا موجب بن گیا ہے۔تیل سے مالا مال بیشتر عرب ممالک کی تمام تر نیازمندی کے باوجود امریکہ تیل کے ذخائر پر براہ راست قبضہ کرنے کے لئے تُل گیا ہے تو اس سے امریکی آئل مافیا کی ہوس کا اظہار ہوتا ہے۔ اپنے ہولناک اسلحہ کی آزمائش بھی ایک جزوی امریکی مقصد ہے۔ یقیناً اس طرح امریکہ اپنے اسلحہ کی عملی جانچ کرنے کے ساتھ روس،چین اور کسی رنگ میں مقابل آنے والے دوسرے ممالک



کو پیغام دینا چاہ رہا ہے کہ ہم اتنے طاقتور ہو چکے ہیں۔لیکن عراقی قوم نے جس طرح ابھی تک امریکی حملوں کا سامنا کیا ہے اور تمام تر بے سروسامانی کے باجود امریکی فوج کو جس طرح پریشان کر دیا ہے،اس سے امریکہ کی دھاک بیٹھنے کے بجائے جگ ہنسائی ہو رہی ہے۔اب تو میں روشن دن کی طرح کہہ سکتا ہوں کہ ایران اور شمالی کوریا کے خلاف امریکی حملہ کے نتیجہ میں امریکی افواج کو اتنی مار پڑے گی کہ وہ ویت نام کی مار کو بھی بھول جائیں گے۔باقی ظاہری اسباب کے حوالے سے بے شک امریکہ بے سروسامان عراقیوں پر اپنی قاہرانہ قوت کے باعث وقتی غلبہ پالے گا لیکن ابھی اس کے لئے کئی بار امریکی افواج کو خاک چاٹنی پڑے گی اور کوئی بعید نہیں کہ کسی معجزانہ تبدیلی کے نتیجہ میں امریکہ کو اپنی جارحیت بند ہی کرنا پڑ جائے۔

جہاں تک عرب خطہ پر اسرائیل کی بالا دستی کی بات کا تعلق ہے یہ ایک کھلی حقیقت ہے۔میں ان اسرائیلی کاریگروں کی کاری گری پر حیران ہوں جنہوں نے امریکی حکام کو اس حد تک اپنا گرویدہ بنا لیا ہے کہ وہ اسرائیلی مفادات کی خاطر کچھ بھی کر سکتے ہیں۔اور یہ سب جو کچھ ہو رہا ہے امریکہ کی اپنی ترجیحات کے ساتھ ساتھ اسرائیلی مفادات کو بھی مدنظر رکھ کر ہو رہا ہے۔ یہ ساری وضاحت اس لئے کرنا پڑی کہ ہمارے جو بعض دانشور امریکی عزائم کے کسی ایک یا دو زاویوں کو درست مان کر باقی پہلوؤں کو رد کر رہے ہیں انہیں یہ اندازہ ہو کہ اپنی اپنی جگہ سارے امریکی مقاصد اور زاویوں کی نشاندہی بالکل درست ہے۔یہ الگ بات کہ بعد کے حالات نے ان میں سے بعض مقاصد کو ضائع کر دیا۔

عراق پر امریکی حملہ کے بعد ہمارے دانشور طبقہ کی طرف سے چند اہم اور دلچسپ باتیں کی گئی ہیں۔بوجوہ ان کا ذکر بھی یہاں کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

اردو کے بیشتر اہم ٹی وی چینلز پر بڑے زور کے ساتھ یہ آواز اٹھائی گئی ہے کہ ’’گریٹر اسرائیل‘‘ کے نقشہ میں مکہ مدینہ کو بھی شامل رکھا گیا ہے مجھے خوشی ہے کہ بیداری اور خطرے کی نوعیت کو سمجھنے والی یہ بیداری پیدا ہوئی ہے۔اسی حوالے سے متحدہ مجلس عمل کے مرکزی صدر مولانا شاہ احمد نورانی کا ایک بیان روزنامہ ’’جنگ‘‘ کے انٹرنیٹ ایڈیشن مورخہ ۲۵/مارچ ۲۰۰۳ء میں شائع ہوا ہے۔اس کا یہ اقتباس دیکھئے:

’’عراق پر امریکا کی جنگ صرف تیل کی خاطر نہیں یہ ’’عظیم اسرائیل منصوبہ‘‘ کے لئے ہے جس کی

تکمیل کی خاطر افغان اور عراق جنگ کی گئی اب اس کے بعد ایران، سعودی عرب اور پاکستان، پھر دوسرے اسلامی ممالک کی باری ہے اور اسرائیل نے ''عظیم اسرائیل منصوبہ'' تیار کر رکھا ہے جس میں مکہ اور مدینہ بھی شامل ہیں۔اس نقشہ کی کاپی میرے پاس بھی موجود ہے۔۔۔۔یہودی مکہ اور مدینہ سے نکالے جانے کا بدلہ لینا چاہتے ہیں''

میں نے لگ بھگ ایک سال پہلے اپنے ۱۳رمئی ۲۰۰۲ء کے کالم میں نہ صرف یہودی غصہ کے اسباب کو بعینہ بیان کیا تھا بلکہ یہ بھی لکھا تھا:

''اس اسرائیلی موقف کے خلاصہ کے ساتھ یہاں یہ واضح کر دوں کہ آج سے لگ بھگ پچاس سال پہلے گریٹر اسرائیل کا جو نقشہ بنایا گیا تھا اس میں مکہ اور مدینہ دونوں کو اسرائیل میں شامل دکھایا گیا تھا۔'' (کالم ''تاریخ سے فرار کیوں''۔آن لائن ۱۳رمئی ۲۰۰۲ء)

پھر میں نے اپنے کالم ''انتہائی خطرے کی گھنٹی'' میں اُس وقت اسی بات کو دہرایا تھا جب امریکہ کے ایک تھنک ٹینک نے ''سعودی عرب کو بدی کا محور'' قرار دینے کی رپورٹ ریلیز کی تھی۔ویسے تو میرے مذکورہ دونوں کالم اسی ویب سائٹ پر دیکھے جا سکتے ہیں لیکن یہاں اپنے دوسرے کالم کا ایک اقتباس بھی درج کر دینا ضروری سمجھتا ہوں:

''میں نے اپنے کالم زیرِ ذیلی عنوان ''تاریخ سے فرار کیوں؟'' میں واضح کیا تھا کہ گریٹر اسرائیل کے لگ بھگ نصف صدی پرانے نقشہ کے مطابق یہودیوں نے مکہ اور مدینہ کو بھی گریٹر اسرائیل کا حصہ بنا رکھا ہے۔اور یہی امریکی تھنک ٹینک کی رپورٹ ریلیز کرنے کا دوسرا اور اہم مقصد ہے۔عراق اور ایران سے نمٹنے کے بعد امریکہ اندازہ لگائے گا کہ اب وہ قلبِ اسلام پر حملہ کر دے یا نہیں؟۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اس کا ایک نتیجہ تو امریکہ کی اپنی توقعات کے مطابق ہو سکتا ہے کہ وہ جیسے ساری دنیا میں دندناتا پھرتا ہے ویسے ہی عالمِ اسلام کے مقدس ترین مقامات کو بھی یہودی عزائم کے مطابق کر دے۔لیکن اس کا دوسرا نتیجہ یہ بھی نکل سکتا ہے کہ پورے عالمِ اسلام کی حکومتیں بے بس ہو جائیں اور پورا عالمِ اسلام ''ناقابلِ تسخیر'' سمجھے جانے والوں کی تاریخ اور جغرافیہ سب کچھ تبدیل کر کے رکھ دے۔ابابیلوں کا ایک واقعہ پہلے بھی ہو چکا ہے۔''

(کالم ''انتہائی خطرے کی گھنٹی'' آن لائن ۱۲راگست ۲۰۰۲ء)

مجھ جیسے گمنام بندے کے لکھے ہوئے اور نشان زد کئے ہوئے خطرے کو کسی رنگ میں سہی



بڑی قومی سطح پر نہ صرف قابلِ اعتنا سمجھا گیا ہے بلکہ اس پر ممکنہ ردِ عمل بھی سامنے آ رہا ہے۔میری غرض بھی اتنی تھی کہ خطرے کا ادراک کیا جائے۔نام کسی کا بھی ہو اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔میرے مذکورہ حوالے میں مکہ مدینہ کے حوالے سے ''ابابیلوں'' کا واضح اشارا دیا گیا ہے۔مجھے خوشی ہے کہ اے آر وائی چینل کے معروف پریزینٹر ڈاکٹر شاہد مسعود نے اسے حالیہ دنوں میں اتنے موثر اور عمدہ طریقے سے اپنے پروگراموں میں دہرایا ہے کہ اب ابابیلوں کا ذکر ان سے ہی منسوب اچھا لگتا ہے۔

آخر میں ایک اور خطرہ کی نشاندہی بھی بروقت کر دوں۔امریکہ نے عراقی عوام کی حیران کن مزاحمت سے بوکھلا کر پہلے روس پر الزام لگایا کہ وہ عراق کی مدد کر رہا ہے۔اب وہ شام پر یہی الزام لگا رہا ہے اور ایران کو بھی اس قضیہ میں غیر ضروری طور پر ملوث کرنے لگا ہے۔اگر تو یہ محض امریکی بوکھلاہٹ کا نتیجہ ہے اور محض بیان بازی ہے تو اس سے صرف نظر کیا جا سکتا ہے لیکن اگر یہ اس کی سوچی سمجھی چال ہے تو پھر امریکہ پوری انسانیت کو تیسری عالمگیر جنگ کی طرف دھکیل رہا ہے۔صرف روس یا ایران کی حد تک امریکی الزام تراشی محدود رہے تو اس سے لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے لیکن اگر شام کو اس معاملہ میں پوری طرح شامل کر لیا گیا تو پھر اس لڑائی کا مرکز ملک عراق نہیں بلکہ ملک شام ہو جائے گا۔اور اگر ملک شام اس لڑائی کا مرکز بن گیا تو پھر تیسری عالمگیر جنگ اور عالمی ایٹمی تباہی کو روکنا امریکہ کے بس میں بھی نہیں رہے گا۔میرے اس تجزیہ میں میری ذاتی سوجھ بوجھ سے زیادہ میرے اس مطالعہ کا دخل ہے جس میں آسمانی اور دینی کتب سے بہت کچھ اخذ کیا گیا ہے۔اس کے نتیجہ میں امریکہ ساری دنیا کو بھی لے ڈوبے گا اور خود بھی نہیں بچے گا۔اپنے آج کے کالم کو آسکر ایوارڈ جیتنے والے معروف امریکی فلمساز Micheal Moore کے اُن الفاظ پر ختم کرتا ہوں جو انہوں نے اسی ماہ آسکر ایوارڈ وصول کرتے ہوئے صدر بُش کو مخاطب کرتے ہوئے کہے تھے۔

We are against this war Mr.Bush shame on you!

☆☆☆

# موجودہ حالات اور مذہبی پیشین گوئیاں

۳۰ مارچ کو میرا گزشتہ کالم ''عراق پر اینگلو امریکن حملہ'' آن لائن ہوا۔اس کے آخر میں ،میں نے آسمانی اور دینی کتب کے حوالے سے ایک واضح بات کی تھی۔اسی دن میں نے بعض خاص احباب کواس کے بارے میں اطلاع دی۔ مجھے خوشی ہے کہ ۳۱؍مارچ کو معروف ٹی وی چینل اے آر وائی کے پروگرام ویوز آن نیوز میں اسی حوالے سے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سے گفتگو کر کے اس زاویے سے آنے والے دنوں کو سمجھنے کے لئے کوشش کی گئی۔ڈاکٹر اسرار احمد پاکستان کے ممتاز اور معتبر علماء میں شمار ہوتے ہیں۔لیکن افسوس کہ قرآن وحدیث سے درپیش حالات کے بارے میں کوئی ٹو دی پوائنٹ بات کرنے کے بجائے وہ فروعی اور متنازعہ نوعیت کے حامل دینی مسائل میں الجھ کر رہ گئے ۔اس میں ان کا کوئی قصور نہیں وہ زیر بحث موضوع پر زیادہ غور وخوض ہی نہیں کر پائے تھے۔ چنانچہ میں اپنی طرف سے اسی موضوع پر اپنا موقف بیان کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔

اصل موضوع کی طرف آنے سے پہلے اپنے قارئین کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ایٹمی جنگ کی تباہ کاریوں کا احساس میرے ذہن میں ایک عرصہ سے اضطراب پیدا کرتا رہا ہے۔اس کے نتیجہ میں میں نے اسی ایک موضوع پر تین مختلف کہانیاں لکھی تھیں۔پہلی کہانی ۱۹۸۰ء کے آخر میں لکھی گئی اور ادبی جریدہ ''اوراق'' لاہور کے شمارہ فروری مارچ ۱۹۸۱ء میں شائع ہوئی تھی۔اس میں،



میں نے قرآن شریف اور دیگر آسمانی اور دینی کتب کے ایسے حوالے یکجا کئے تھے جو واضح طور پر ایٹمی جنگ کی تباہ کاریوں کی نشاندہی کرنے والے تھے۔ بنیادی طور پر یہ کہانی دینی کتب کی پیشین گوئیوں پر استوار ہوئی تھی۔اس کہانی میں ایک جگہ عربوں کی تیل کی دولت کا ہلکا سا سیاسی اشارا بھی دیا گیا تھا۔چنانچہ اس کے نتیجہ میں مجھ سے ۱۹۸۲ء میں پھر ایک کہانی لکھی گئی ''گلاب شہزادے کی کہانی''۔۔۔۔اس میں ایٹمی جنگ کو عربوں کی تیل کی دولت اور عالمی قوتوں کی تیل کی ہوس کے پس منظر میں داستانوی انداز سے بیان کیا گیا تھا۔ایک لمبے وقفہ کے بعد پھر ۱۹۹۲ء میں مجھ سے ایک اور کہانی لکھی گئی۔''کاکروچ'' کے نام سے لکھی گئی میری تیسری کہانی میں ایٹمی جنگ کے بعد کی فضا کو مذہبی کتب یا آئل مافیا کی سیاست کی بجائے سائنسی تناظر میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہ تینوں کہانیاں بنیادی طور پر کہانی کے تقاضوں کے مطابق لکھی گئی تھیں،اور انہیں پڑھتے ہوئے کسی مضمون کی طرح نہیں لینا چاہئے،لیکن ان سے یہ اندازہ ضرور کیا جا سکتا ہے کہ ایٹمی جنگ کے خطرات کو میں تب سے سنجیدگی سے اور تخلیقی سطح پر لے رہا تھا جب ہمارے اردو کے تخلیق کاروں اور دانشوروں کو اس کا وہم و گمان بھی نہیں تھا۔(دلچسپی رکھنے والے احباب ویب سائٹ www.haiderqureshi.com پر میرے افسانوں کے سیکشن میں پہلی دونوں کہانیاں میرے افسانوی مجموعہ ''روشنی کی بشارت'' میں اور تیسری کہانی میرے افسانوی مجموعہ ''قصے کہانیاں'' میں دیکھ سکتے ہیں)۔

یہاں میں افسانہ ''حوا کی تلاش'' میں درج وہ حوالے من وعن پیش کر رہا ہوں جو میں نے قرآن شریف سے اور دیگر مذہبی کتب سے لئے تھے۔ان نو حوالوں میں سے پہلے تین اور آخری دو حوالے قرآن شریف کے ہیں۔ پہلے یہ سارے حوالے دیکھ لیجئے۔

۱۔''تجھے کیا معلوم ہے کہ حطمہ (ایٹم) کیا شے ہے؟ یہ اللہ کی خوب بھڑکائی ہوئی آگ ہے جو دلوں کے اندر تک جا پہنچے گی تا کہ اس کی گرمی ان کو اور بھی زیادہ تکلیف دہ محسوس ہو'' (سورہ ہُمزہ)

۲۔''دنیا پر ایک شدید مصیبت آنے والی ہے اور تجھے کیا معلوم ہے کہ وہ مصیبت کیسی ہے؟ اور ہم پھر کہتے ہیں کہ اے مخاطب! تجھے کیا معلوم ہے کہ یہ عظیم الشان مصیبت کیا چیز ہے؟ یہ مصیبت جب آئے گی تو اس وقت لوگ پراگندہ پروانوں کی طرح ہوں گے اور پہاڑ اس پشم کی مانند ہو جائیں گے جو دھنکی ہوتی ہے۔'' (سورہ القارعہ)

۳۔''جب زمین کو پوری طرح ہلا دیا جائے گا۔اور زمین اپنے بوجھ نکال کر پھینک دے گی اور انسان کہہ اٹھے گا کہ اسے کیا ہو گیا ہے؟''(سورہ زلزال)

۴۔''خداوند کہتا ہے کہ میں نے اپنی غیرت سے اور قہر کی آتش سے کہا یقیناً اسی دن اسرائیل کی سرزمین میں ایک زلزلہ ہوگا۔ یہاں تک کہ سمندر کی مچھلیاں اور آسمان کے پرندے اور زمین کے چرندے اور سارے کیڑے مکوڑے جو زمین پر رینگتے پھرتے ہیں اور سارے انسان جو روئے زمین پر ہیں میرے سامنے تھرتھرا جائیں گے اور پہاڑ اٹھائے جائیں گے اور کڑاڑے بیٹھ جائیں گے اور ہر ایک دیوار زمین پر گر پڑے گی.....ایک شدت کا مینہ اور بڑے بڑے اولے اور آگ اور گندھک برساؤں گا۔اسی طرح میں اپنی بزرگی اور تقدیس کراؤں گا اور بہتیری قوموں کی نظروں میں پہچانا جاؤں گا اور وہ جانیں گے کہ خداوند میں ہوں''

۵۔''دیکھ میں ترا مخالف ہوں اے جوج رُوش اور مسک اور توبال کے سردار! میں تجھے پلٹ دوں گا.....اور میں تجھے ہر قسم کے شکاری پرندوں اور میدان کے درندوں کو خوراک کے لئے دوں گا۔تو کھلے ہوئے میدان میں گر پڑے گا.....اور میں ماجوج پر اور ان پر جو جزیروں میں بے پروائی سے سکونت کرتے ہیں ایک آگ بھیجوں گا.....اور آگے کو میں ہونے نہ دوں گا کہ وہ میرے پاک نام کو بے حرمت کریں''

۶۔''اور دنیا میں ایک حشر برپا ہو جائے گا اور وہ اول الحشر ہوگا اور تمام بادشاہ آپس میں ایک دوسرے پر چڑھائی کریں گے اور ایسا کشت وخون ہوگا کہ زمین خون سے بھر جائے گی اور ہر ایک بادشاہ کی رعایا بھی آپس میں خوفناک لڑائی لڑے گی۔ایک عالمگیر تباہی آوے گی اور ان تمام واقعات کا مرکز ملک شام ہوگا''

۷۔''اے یورپ تو بھی امن میں نہیں اور اے ایشیا تو بھی محفوظ نہیں اور اے جزائر کے رہنے والو! کوئی مصنوعی خدا تمہاری مدد نہیں کرے گا۔میں شہروں کو گرتے دیکھتا ہوں اور آبادیوں کو ویران پاتا ہوں''

۸۔''کیا یہ زمین میں نہیں پھرے کہ دیکھتے کہ ان سے پہلوں کا کیا انجام ہوا؟ وہ ملک میں ان سے تعداد اور طاقت میں بھی زیادہ تھے اور عمارت وغیرہ کے فنون میں بھی زیادہ ماہر تھے۔لیکن ان کے اعمال نے ان کو کوئی نفع نہیں دیا تھا۔اور جب ان کے پاس ان کے رسول نشانات لے کر آئے تو



ان کے پاس جو تھوڑا بہت علم تھا اس پر فخر کرنے لگے اور جس عذاب کی ہنسی اُڑاتے تھے اسی نے ان کو گھیر لیا۔پھر جب انہوں نے ہمارا عذاب دیکھا تو کہہ اٹھے ہم تو اللہ کو ایک قرار دیتے ہوئے اس پر ایمان لاتے ہیں اور اس کے ساتھ جن چیزوں کو ہم شریک قرار دیا کرتے تھے ان کا ہم انکار کرتے ہیں۔پس جب انہوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا تو ان کے ایمان نے ان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔یہی اللہ کی مقررہ سنّت ہے جو اس کے بندوں میں جاری چلی آتی ہے''۔

(سورہ المومن۔آیت ۸۲ تا آخر)

۹۔''تم پر آگ کا ایک شعلہ گرایا جائے گا اور تانبا بھی گرایا جائے گا پس تم دونوں ہرگز غالب نہیں آسکتے اب بتاؤ کہ تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کا انکار کرو گے''

(سورہ رحمٰن۔آیت ۳۵)

یہاں حوالہ نمبرا یک کے بارے میں ایک وضاحت کردوں کہ''سورہ ہُمزہ'' کی ان آیات میں حطمہ یا حطم کو میں ایٹم ہی قرار دیتا ہوں اور میرا یہ استدلال ۱۹۸۰ء سے ہے۔حطم اور ایٹم کی لسانی ہم آہنگی اپنی جگہ۔۔۔میری درج کردہ آیات کے ساتھ سورت کی اگلی آیات کو ملا کر پڑھا جائے تو ایٹمی حملہ کے نتیجہ میں ہونے والی تباہی کے اثرات بالکل اسی طرح عیاں ہو جاتے ہیں جیسے سائنسدان اسے بیان کرتے ہیں، ایٹمی شعلوں کی تصویریں لمبے ستونوں جیسی دکھائی دیتی ہیں۔تابکاری اثرات پہلے دل کو گرفت میں لیتے ہیں اور پھر سارے جسم کو لپیٹ لیتے ہیں۔اسی منظر کو اس سورۃ میں اتنے واضح الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے کہ حطم کو ایٹم کہنا بالکل درست دکھائی دیتا ہے۔

حوالہ نمبر تین کے بارے میں خاص طور پر اور بعض دوسرے قرآنی حوالوں کے بارے میں عام طور پر قیامت کا تصور لیا جاتا ہے۔میرے ایک بہت ہی اچھے اور بزرگ دوست فضل من اللہ صاحب تھے۔ہمارے درمیان فکری بُعد بہت زیادہ تھا لیکن ان کی اعلیٰ ظرفی تھی کہ مجھے نہ صرف عزیز رکھتے تھے بلکہ میری ادبی حوصلہ افزائی بھی کیا کرتے تھے۔جب وہ جماعت اسلامی کے ادبی رسالہ''سیارہ'' کے مدیر تھے،تب انہوں نے مجھے اس رسالہ میں بھی شائع کرنے کی ہمت کی۔میرے اس افسانہ کو انہوں نے بحیثیت افسانہ بہت پسند کیا تھا لیکن اس میں شامل بعض آیات پر اور خاص طور پر سورت زلزال کی آیات پر میرے استنباط سے اختلاف کرتے ہوئے مجھے

لکھا کہ یہ تو قیامت کے بارہ میں آیات ہیں۔تب میں نے انہیں لکھا تھا کہ یہ ایک عالمگیر تباہی کی خبر ہے۔جس میں کچھ نہ کچھ لوگ زندہ بچ رہیں گے۔اسی لئے تو وہ پکار اٹھیں گے کہ یہ ایسی ہنستی بستی دھرتی کو کیا ہوگیا ہے؟ اگر یہ قیامت کے بارے میں آیات ہیں تو پھر قیامت کے دن کون سے انسان ہوں گے جو قیامت کے باوجود زندہ بچ رہیں گے اور یہی الفاظ دہرائیں گے۔میرے جواب پر انہوں نے مزید بحث نہیں کی تھی۔

حوالہ نمبر۵ جو بائبل کی کتاب حزقی ایل سے ہے۔اس میں جوج کے نام سے واضح طور پر روس، ماسکو اور توبال کو مخاطب کیا گیا ہے۔ ماجوج سے مراد پانی والا جوج ہے (پانی کو عربی میں ما کہتے ہیں) جو محفوظ سمندروں میں گھرا ہوا امریکہ ہے۔پس ایٹمی جنگ سے تباہ تو سب نے ہی ہونا ہے۔سورہ رحمٰن (حوالہ نمبر۹) میں تو صاف لفظوں میں دونوں قوتوں کی مکمل تباہی کی خبر درج ہے۔ان وضاحتوں کے باوجود ہر دوست کو ان پیشین گوئیوں کے بارے میں اپنی اپنی رائے اور اپنے اپنے تحفظات رکھنے کا حق حاصل ہے۔

یہ ساری پیشین گوئیاں ایٹمی جنگ کے حوالے سے ہیں۔اس کے بہت زیادہ امکانات ہونے کے باوجود ضروری نہیں کہ ایٹمی جنگ ابھی ہو جائے۔ مجھے بخاری شریف سے ایک بہت خوف دلانے والا حوالہ ملا ہے۔اس سے مجھے ڈر لگ رہا ہے کہ ہوسکتا ہے ابھی ایٹمی جنگ نہ ہو اور گریٹر اسرائیل کے نقشہ پر عملدرآمد کی سازش کے نتیجہ میں ابھی ہمیں بہت زیادہ ذلت کے دن دیکھنا پڑ جائیں۔میں اس حدیث کا متن بعد میں درج کروں گا پہلے یہاں ایک اور خطرے کے امکان کی نشاندہی کردوں۔انڈیا میں جب بابری مسجد کو شہید کیا گیا تھا تب انتہا پسند ہندو حلقوں کے ایک لیڈر نے اشتعال انگیزی کے ساتھ یہاں تک کہہ دیا تھا کہ تم مسلمان جو اس مسجد کو رام مندر بنانے میں رخنہ ڈال رہے ہو ابھی تو ہم نے اپنا مکہ والا بڑا مندر بھی تم لوگوں سے لینا ہے جو تم لوگوں نے زبردستی ہم سے چھین لیا تھا۔اُن دنوں میں شدید ردعمل کو دیکھتے ہوئے بی جے پی کی مرکزی قیادت نے ایسے بیانات سے اپنی بریت ظاہر کر دی تھی لیکن اس بیان میں پوشیدہ مکروہ عزائم کو مدنظر رکھا جائے اور ہندوؤں کی انتہا پسند قیادت کے اسرائیل سے غیر معمولی طور پر بڑھتے ہوئے تعلقات کی گرمجوشی کو دیکھا جائے تو قلب اسلام پر عالمی گِدھوں کے منڈلانے کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔کیا گریٹر اسرائیل کا خواب دیکھنے والوں نے انڈیا کے انتہا پسند ہندوؤں کی قیادت کو



مکہ میں ان کا حصہ دلانے کا کوئی وعدہ تو نہیں کرلیا؟

خدا کرے یہ سب مفروضے ہوں لیکن حالات کی چاپ بہت سے وسوسے پیدا کر رہی ہے۔ان سارے امکانی اندیشوں کو ذہن میں رکھیں اور یہ بھی خیال رہے کہ امریکی افواج کے افسران میں کئی بلیک لوگ شامل ہیں۔اب ''تجرید بخاری'' جلد اول کی کتاب ''وجوب حج اور اس کی فضیلت کا بیان'' کی روایات نمبر۷۶۹ اور۷۷۲ ملاحظہ فرمائیں۔

''حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں حضور انورﷺ نے فرمادیا تھا کہ کعبہ ایک حبشی، جس کی پنڈلیاں بہت چھوٹی ہوں گی ویران کردے گا۔''

''حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں (ایک روز حضور انورﷺ) نے فرمایا میں اس وقت گویا اس شخص کو دیکھ رہا ہوں جو خانہ کعبہ کو ویران کردے گا۔سیاہ رنگ ہوگا۔پاؤں کے تلوے اٹھے ہوں گے''

میں ان احادیث کی روشنی میں مزید کچھ کہنے سے قاصر ہوں۔ان احادیث کا علم رکھنے والے کوئی دوست حوصلہ دلانے والی اور دل رکھنے والی کوئی بات بتاسکیں تو اس سے مجھے بھی کچھ تسلی ہو جائے گی۔اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کے انفرادی اور اجتماعی گناہوں کو معاف فرمائے۔اور یہ احادیث انذاری پیشین گوئیوں کی طرح پوری ہونے کے بجائے ٹل جائیں۔ہم تو دعا کے سوا کچھ بھی نہیں کرسکتے۔

اے خاصہء خاصانِ رُسلؐ وقتِ دعا ہے
اُمت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے

☆☆☆

# تصویر کا ایک اور رُخ
# آئندہ امکانات

عالمی صورتحال اتنی گنجلک ہوتی چلی جا رہی ہے کہ پیش آمدہ صورتحال کی روشنی میں مستقبل کی کوئی حتمی بات کرنا مشکل ہو گیا ہے۔تاہم اپنی سمجھ کے مطابق مجھے جو نقشہ دکھائی دے رہا ہے اور اس میں امکانات کے جتنے مختلف پہلو ہیں،انہیں بیان کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

پہلی جنگِ عظیم کے بعد سے قائم عالمِ عرب کا موجودہ نقشہ سلطنتِ عثمانیہ کے زوال کے نتیجہ میں امریکہ اور یورپ کا بنایا ہوا نقشہ ہے۔بعد میں چند ممالک سوویت یونین کے حلقہ میں چلے گئے لیکن بیشتر عالمِ عرب امریکہ اور مغرب کے حلقۂ اثر میں رہا۔بہت کم لوگوں کو یاد رہ گیا ہوگا کہ ارضِ حجاز کے بادشاہ شریف حسین کو ہٹا کر اور ارضِ حجاز کو سعودی عرب میں بدل کر جب سعودی حکمرانوں کو مکہ،مدینہ کا اقتدار سونپا گیا تھا تب سعودی عرب کا پہلا وزیرِ خارجہ ایک انگریز کو بنایا گیا تھا۔اس لئے یہ ذہن میں رکھنا چاہئے کہ ان سارے عرب بادشاہوں کی بادشاہتوں کے قیام و استحکام میں مغرب کا عمومی طور پر اور امریکہ اور انگلینڈ کا خصوصی طور پر بنیادی کردار رہا ہے۔موجودہ سعودی عرب کے دو اہم خطوں ارضِ نجد اور ارضِ حجاز میں اسلامی فکر کی تعبیر و تشریح میں بہت زیادہ فکری بُعد تھا۔نجد کا علاقہ امام محمد بن عبدالوہاب کے افکار کے زیرِ اثر تھا جبکہ ارضِ حجاز میں سوادِ اعظم کا رجحان نمایاں تھا۔جب عرب ممالک میں نئی مملکتیں بنائی گئیں،اور نئی اکھاڑ پچھاڑ ہوئی تب سوادِ اعظم سے تعلق رکھنے والے شریف حسین کو مکہ،مدینہ سے نکال کر سعودی خاندان برسرِ اقتدار آ گیا۔اس خاندان کی بادشاہت کو سب سے پہلے امریکہ اور انگلینڈ نے تسلیم کیا۔اس ایک بڑی مثال سے یہ



بتانا مقصود ہے کہ اس وقت پھر جو نئے سرے سے اکھاڑ پچھاڑ ہونے لگی ہے تو اس کی محرک بھی وہی ''بادشاہ گر'' قوتیں ہیں جو گزشتہ ایک صدی سے یہ کام کرتی آ رہی ہیں۔

سعودی خاندان کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد ''شرک کا خاتمہ'' کرنے کے دعووں کے ساتھ وہاں بہت سے ایسے اقدامات کئے گئے جو سوادِ اعظم اور اہلِ تشیع دونوں کی دلآزاری کا باعث تھے۔جیسے جنت البقیع اور جنت المعلیٰ میں قبروں کے تعویذ ہٹا کر انہیں بے نام و نشان کر دینے کے اقدامات۔۔۔پھر وہاں اپنے مسلک کے پرچار کے ساتھ دوسرے اسلامی مسالک کے لئے راہیں بند کر دی گئیں۔یہ ویسا ہی اقدام تھا جیسا عقیدہ کے طور پر افغانستان میں طالبان نے اختیار کیا تھا۔اور جو طالبان کی فاش غلطیوں میں سے ایک غلطی تھا۔اسی غلطی کا نتیجہ ہے کہ اب امریکہ کو شمالی اتحاد کے لوگ آسانی سے مل گئے ہیں۔یہ الگ بات کہ وہ امریکہ کے لئے مفید ثابت ہوتے ہیں یا نہیں۔۔۔اس بات کو فی الحال یہیں چھوڑتے ہوئے ذرا ان مسائل کو ایک اور زاویے سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اگر تھوڑا سا پلٹ کر دیکھیں تو بیسویں صدی کے آغاز پر دنیا بھر میں عالمِ اسلام کے پاس صرف دو تین آزاد ریاستیں تھیں۔بیسویں کے نصف تک آتے آتے دنیا میں آزاد مسلم ممالک کی تعداد ۵۰ تک پہنچ گئی۔ذرائع وسائل کے لحاظ سے عرب ممالک تو تیل کی دولت سے اتنے مالا مال تھے کہ ساری دنیا کے مسلمانوں کی کفالت ہی نہیں کر سکتے تھے بلکہ انہیں اقتصادی طور پر خود کفیل بنا سکتے تھے۔لیکن کسی نے منظم منصوبہ بندی کے تحت ایسا کچھ نہیں کیا۔بس خیرات کے طور پر ہر آنے والے اور مانگنے والے کو بھر دیا اور لینے والے نے بھی اپنی ذات سے آگے کچھ نہیں دیکھا۔ان کے برعکس امریکہ اور انگلینڈ کی ذہانت دیکھیں کہ انہوں نے نہ صرف ان عرب ممالک کی سیاسی سرپرستی کی بلکہ ان کے سارے تعمیراتی منصوبے بھی اپنے ہاتھ میں لے لئے،انہیں ہر قسم کی اہم ٹیکنالوجی سے محروم رکھ کر محض اپنا صارف بنائے رکھا۔ان کی ساری دولت اپنے ملکوں کے بنکوں میں ریز رو کرتے گئے اور اب یہ حالت ہے کہ سردی سے بچنے والے بدو کے اونٹ کی طرح امریکہ اور انگلینڈ پورے عربی خیمے میں گھس گئے ہیں اور عربی بدو اب باہر پڑا ٹھٹھر رہا ہے۔

عالمِ اسلام کی مجموعی حالت کا اندازہ کرنے کے لئے اگر سعودی عرب اور پاکستان کی حکومتوں (عرب و عجم) کو مثالی نمونے مان لیا جائے تو اس سے صورتحال کافی حد تک واضح ہو سکتی

ہے۔ان دونوں ملکوں کے معاملات میں زیادہ گہرائی میں جانے کی ضرورت نہیں صرف سامنے کے دو محکموں کی کارکردگی سے ہی بہت کچھ سمجھ میں آجاتا ہے۔دونوں ملکوں کا ٹریفک کا نظام اور دونوں ملکوں کی پولیس کا نظام۔۔دونوں نظام مل کر نظامِ حکومت کی بہترین عکاسی کرتے ہیں۔ دونوں ملکوں کی ٹریفک کا نظام افراتفری اور نفسانفسی کا مظہر ہے جبکہ پولیس کے دو کام ہیں ایک حکمرانوں کے ذاتی اقتدار کا مکمل تحفظ اور دوسرا اپنے ہی عوام کی تذلیل۔۔۔قانون کی حکمرانی کے لمبے چوڑے دعوے تو موجود ہیں لیکن عملاً ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔

ان کے برعکس امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک میں بھی پولیس اور ٹریفک کے دو محکموں کی کارکردگی سے ہی ان سارے ممالک کی مجموعی حالت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔قانون کی خلاف ورزی کوئی بڑے سے بڑا اعلیٰ عہدیدار کرے اسے اسی طرح قانونی کاروائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے جیسے کسی بھی عام شہری کو کرنا پڑتا ہے۔ان ملکوں کی پولیس کے پاس بے پناہ اختیارات ہیں لیکن ان کی پولیس کا عمومی رویہ قانون کے مطابق اپنے فرائض ادا کرنا ہی ہے۔اسی لئے کسی بھی عام شہری کو کسی پولیس مین یا ان کے اعلیٰ افسر سے بات کرتے ہوئے کبھی کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔

امریکہ نے تیسری دنیا یا اسلامی دنیا کے ساتھ جو کچھ بھی کیا ہے، وہ سب اپنی جگہ لیکن خود اپنے شہریوں کے ساتھ اس کا رویہ ان کی عزتِ نفس کا احترام کرنے کا ہی نہیں بلکہ ان کی عزتِ نفس کی حفاظت کرنے کا بھی ہے۔اس ایک بنیادی فرق سے ہی اسلامی ملکوں کے حکمرانوں اور اور مغربی دنیا کے حکمرانوں کے فرق کو سمجھا جا سکتا ہے۔

اب صورتحال یوں دکھائی دیتی ہے کہ امریکہ مشرقِ وسطیٰ کے نقشے کو تبدیل کرنے پر تلا ہوا ہے۔اس نقشے کی تبدیلی میں اگرچہ ایک بڑا ٹارگٹ تو مکہ، مدینہ جیسے مقدس ترین مقامات پر قبضہ کرنا ہی ہے لیکن امریکہ کو بخوبی علم ہے کہ ابھی اس کے لئے ایسا کرنا مشکل، بہت ہی مشکل ہے۔افغانستان اور عراق کی مزاحمتی قوتوں نے امریکہ کو زک پہنچانے کا جو سلسلہ شروع کیا ہے اس سے بھی امریکی توجہ اصل اہداف سے دور رہے گی۔تاہم اگر اس مزاحمت کو کمزور کر دیا گیا تو پھر امریکہ اپنے پروگرام کی طرف بڑھنا شروع کر سکتا ہے۔سعودی حکمران چونکہ امام محمد بن عبدالوہاب کی فکر کے ترجمان ہیں، اس لئے ان کا پتہ کاٹنے کے لئے امریکہ اب لازماً وہاں سوادِ اعظم سے تعلق رکھنے والوں کو آگے لانے کی کوشش کرے گا۔لیکن سوادِ اعظم میں بھی دو بڑے طبقے



ہیں۔یوں تو بہت سارے فرقے خود کو حنفی العقیدہ کہتے ہیں اور ان کا کسی نہ کسی رنگ میں امام ابوحنیفہ کے مسلک سے تعلق بھی بنتا ہے تاہم دو بڑے طبقے بریلوی اور دیوبندی مانے جا سکتے ہیں۔ان میں سے دیوبندی مسلک کے لوگ حنفی ہوتے ہوئے بدرسومات سے بیزاری کے رویے کے باعث وہابی مسلک سے کافی قریب ہو جاتے ہیں۔مذہبی طور پر جماعت اسلامی اور اسی انداز کی دوسری اسلامی جماعتیں بھی وہابی مسلک سے فکری طور پر نسبتاً قریب ہیں۔ان سارے گروپوں کے گزشتہ تیس چالیس برسوں سے سعودی حکومتوں سے نیازمندانہ مراسم ہیں اور سعودی حکومت کے لئے یہ لوگ ایک حد تک قابلِ قبول رہے ہیں۔اہلِ تشیع کا معاملہ ایک تیسرے فریق کے طور پر سامنے آتا ہے جو سعودی عرب کے مشرقی منطقہ میں آج بھی عددی اکثریت کے حامل ہیں۔دمام، الخرج، خطیف اور نجران کے علاقے شیعہ آبادی پر مشتمل ہیں۔عراق اور شام میں بھی ان کی بڑی تعداد موجود ہے۔

اب امریکہ کا ہاتھ پڑتا ہے تو اس کی کوشش یہ رہے گی کہ سوادِ اعظم میں جو طبقے وہابی مسلک سے نسبتاً قریب ہیں انہیں درمیان میں لا کر اپنی مرضی کے ناگوار فیصلے منظور کرائے جائیں۔اس میں تیل کے پسندیدہ ذخائر تک رسائی سب سے بڑا مقصد رہے گا۔اسی لئے اب امریکہ ایک طرف پاکستان میں ''ایم ایم اے'' میں طالبان کے دوست اور سابق سرپرست گروپوں سے لے کر طالبان کے بعض اہم رہنماؤں تک سے اندرخانے بات کر رہا ہے اور اس کے لئے وقتاً فوقتاً مختلف دباؤ بھی ڈالتا رہتا ہے تاکہ بات چیت نتیجہ خیز ہو سکے۔تو دوسری طرف ایسا کچھ نہ ہونے کی صورت میں سعودی عرب کا نقشہ تبدیل کرنے کی منصوبہ بندی ہو رہی ہے۔عرب دنیا کا نقشہ بدلنے کا عمومی تہیہ کر لیا گیا ہے جس میں عراق کے حصے بخرے کرنے کے ساتھ بعض خلیجی ریاستوں کی توڑ پھوڑ بھی شامل ہے۔تاہم ان میں سب سے زیادہ تکلیف دہ اور خطرناک اقدام اس سرزمین کی توڑ پھوڑ ہوگا جو مکہ، مدینہ جیسے مقدس ترین مقامات کی سرزمین سعودی عرب ہے۔کیونکہ مکہ، مدینہ کے بارے میں اسرائیلی عزائم اب کسی سے ڈھکے چھپے نہیں رہے۔

امریکہ نے تھوڑا سا بتا کر اور تھوڑا سا چھپا کر اپنے ان عزائم کو ظاہر کر دیا ہے۔بلکہ ''چھپانے اور بتانے'' کے ایسے عمل کے دوران سعودی عرب کے تین چار حصوں میں ایسی تقسیم کی بات کی جا چکی ہے۔ایک حصہ مکہ اور مدینہ کے لگ بھگ پانچ سو کلومیٹر رقبہ پر مشتمل کر کے سوادِ اعظم کے سپرد کر دیا

جائے ،ایک حصہ جوشیعہ اکثریتی علاقہ ہے وہاں شیعہ عوام کو’آزادی‘ دلا دی جائے ۔جبکہ نجد کا پرانا علاقہ یا تو موجودہ سعودی خاندان کے بعض شہزادوں کو دے دیا جائے یا وہاں بھی اپنی مرضی کے لوگ لائے جائیں ۔اس تقسیم میں ابھی مزید ردوبدل ہوسکتا ہے۔اس سارے کھیل میں سب سے حساس معاملہ مکہ، مدینہ کے مقدس مقامات کی عزت اور سلامتی کا ہے۔ان کو چھیڑنے سے پوری دنیا میں ہنگامہ برپا ہوسکتا ہے۔لیکن اگر سوادِ اعظم کے’’وہابی مخالف‘‘ طبقات کو یہاں آگے لایا گیا تو اس طرح ممکن ہے کہ عالمی سطح پر مسلمان کوئی بڑا احتجاج نہ کر پائیں ۔کیونکہ ایسی صورت میں پہلے منظّم طور پر سعودی حکمرانوں کی’’شرک‘‘ کے خلاف ان کاروائیوں کو مشتہر کیا جائے گا جوگزشتہ پون صدی سے وہاں جاری و ساری ہیں (اور جن میں سے بعض بلاشبہ بہت تکلیف دہ بھی ہیں )ایسی صورت میں سعودی خاندان کو ہٹانے کا امریکی کھیل عراق کے مقابلہ میں زیادہ کامیاب ہوسکتا ہے۔یہ جو اَب مکہ، ریاض، جدہ اور دوسری سعودی شہروں میں بم دھماکوں کی کاروائیاں شروع ہوئی ہیں، انہیں لاکھ القاعدہ یا دہشت گردوں کے کسی گروہ سے جوڑا جائے، بے شک اس میں مقامی لوگ ہی شامل ہوں لیکن ان کے پسِ پشت لازمی طور پر امریکہ موجود ہے۔وہی یہ کاروائیاں کروارہا ہے۔یہ سعودی عرب کے نقشہ میں تبدیلیوں کے لئے کی جانے والی سازشوں کی ابتدائی کاروائی ہے۔۔۔مستقبل قریب میں مزید اور مختلف قسم کے اقدامات سامنے آسکتے ہیں ۔منصوبہ بندی میں بعض تبدیلیاں بھی کی جاسکتی ہیں۔

گزشتہ نصف صدی سائنسی ایجادات وانکشافات کا حیرت انگیز دورانیہ تھا۔معلوم انسانی تاریخ میں اتنی برق رفتار اور حیران کن ترقیات ہوئیں ۔اسی عرصہ میں ۵۰ سے زائد مسلمان ملک آزاد ہو چکے تھے۔لیکن ہمارے حکمرانوں نے گزشتہ نصف صدی سے اپنی قوم اور اپنے ملک کی ترقی کے لئے عمومی طور پر بھی کچھ نہیں کیا چہ جائیکہ جدید علوم کے حوالے سے کوئی اہم پیش رفت کی ہوتی۔مسلم ممالک میں کوئی ٹھوس اور موثر ربط باہم نہیں رہا۔تمام مسلم ممالک میں کوئی اتحاد اور دوستی تو کیا ہو پاتی، الٹا انتشار وافتراق کے کئی مناظر دیکھنے میں آتے رہے۔اور اب شاید ان سارے نصف صدی کے گناہوں کی قیمت ادا کرنے کا وقت قریب آ گیا ہے۔امریکہ یا اسرائیل وہی کچھ کررہے ہیں جوان کی کتابوں میں ان کے لئے خوشخبریاں درج ہیں اور وہی کچھ کررہے ہیں جوان کے قومی مفاد کے مطابق ہے۔۵۰ سے زائد اسلامی ممالک کے حکمرانوں نے تو نصف صدی سے



زائد عرصہ تک اپنے ذاتی مفاد کے علاوہ کچھ سوچا ہی نہیں ۔انہوں نے تو یہی دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی اگر یہودیوں کی کتابوں میں لکھی باتیں ان کے لئے آج پوری ہورہی ہیں تو ہم اتنا ہی دیکھ لیتے ہیں کہ ہمارے لئے ہماری کتابوں میں کوئی خاص انتباہ تو درج نہیں ہیں، تاکہ ان کی روشنی میں اپنی اصلاح کرلیں ۔قرآن مجید سے لے کر احادیث مبارکہ تک اور بعد کی بعض کتب میں بھی ایسے انتباہ اور انذار درج تھے لیکن سب نے ان سے اغماض برتا اور اب تو شاید یومِ حساب قریب آ گیا ہے۔امریکی صدر بُش اگلا الیکشن ہار جائیں تب بھی امریکی پالیسی میں بنیادی تبدیلی کے امکانات بہت کم ہیں ۔اس لئے صدر بُش کی شکست کی امید پر خوش ہونے سے زیادہ اپنے آنے والے دنوں کی فکر کرنا زیادہ بہتر ہے۔

عرب ممالک اور دیگر اسلامی ممالک پر ابھی بہت کڑے وقت آنے والے ہیں ۔اگرچہ اب کافی تاخیر ہوچکی ہے تاہم اپنی اجتماعی غلطیوں اور گناہوں کا احساس کرکے ان کی معافی خدا سے تو مانگی جاسکتی ہے۔

مجھ کو معلوم ہیں پیرانِ حرم کے انداز
ہو نہ اخلاص تو دعویٰ نظر لاف و گزاف
اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف
اس کی تقدیر میں محکومی و مظلومی ہے
قوم جو کر نہ سکی اپنی خودی سے انصاف
فطرت افراد سے اغماض بھی کرلیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

(علامہ اقبال)

☆☆☆

# حیدر قریشی کی جملہ تصانیف

**شاعری:**

☆**سلگتے خواب**(غزلیں)☆**عمرِ گریزاں**(غزلیں،نظمیں اور ماہیے)
☆**محبت کے پھول**(ماہیے)☆**دعائے دل**(غزلیں،نظمیں)
☆**درد سمندر**(غزلیں،نظمیں اور ماہیے)
☆☆**غزلیں،نظمیں،ماہیے**(ایڈیشن اول۔۔پہلے چار شعری مجموعوں کا مجموعہ)
☆☆**غزلیں،نظمیں،ماہیے**(ایڈیشن دوم۔پانچوں شعری مجموعوں کا مجموعہ)

**نثر:**

☆**روشنی کی بشارت**(افسانے)☆**قصے کہانیاں**(افسانے)
☆**ایٹمی جنگ**(تین افسانے اردو،ہندی میں ایک ساتھ)☆**افسانے**(دو مجموعے)
☆**میں انتظار کرتا ہوں**(افسانوں کا ہندی ترجمہ)☆**میری محبتیں**(خاکے)
☆**کھٹی میٹھی یادیں**(یادیں)☆**فاصلے، قربتیں**(انشائیے)
☆☆**افسانے،خاکے،یادیں،انشائیے**(پانچ نثری مجموعے ایک جلد میں۔)
☆**سوئے حجاز**(سفرنامہ عمرہ،دوسرا ایڈیشن سفرِ حج کی روداد کے اضافہ کے ساتھ)
☆**منظر اور پس منظر**(حالات حاضرہ پر ۲۵ مضامین کا مجموعہ):

**تحقیق و تنقید:**

☆**اردو میں ماھیا نگاری** ☆ **اردو ماھیے کی تحریک**(مضامین)
☆**اردو ماھیے کے بانی...... ھمت رائے شرما**
☆**اردو ماھیا**(ماہیے کے مجموعوں کے پیش لفظ)☆**ماھیے کے مباحث**(مضامین)
☆☆**اردو ماہیا تحقیق و تنقید**(پانچوں کتابیں ایک جلد میں زیرِ اشاعت)
☆**وزیر آغا ...عہد ساز شخصیت**(مضامین)

تحقیق اور تنقید کی کتب کو چھوڑ کر باقی تمام کتب کا میٹر اس ویب سائٹ پر آن لائن ہے۔

**www.haiderqureshi.com**

تحقیق وتنقید کی کتب اور دیگر میٹر بھی جلد ہی اپ لوڈ کیا جا رہا ہے